گفتار
و
کردارِ
سرسیّد
پروفیسر سعید راشد

تعارف

مصنف	سعید راشد
تاریخ پیدائش	20 جنوری 1927ء
رسمی تعلیم	ادبیات اردو انگریزی اور فن تعلیم
مربی درسگاہیں	اسلامیہ کالج بریلی
	بریلی کالج بریلی،
	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
مربی اساتذہ	مولوی محمد محسن،
	جناب مبارک حسین
	ڈاکٹر شوکت سبزواری،
	ڈاکٹر داس گپتا،
	ڈاکٹر عشرت حسین،
	پروفیسر رشید احمد صدیقی
	ڈاکٹر ذاکر حسین خان
رول ماڈل	سرسید احمد خان،
	قائداعظم
ذہنی پس منظر	تحریک پاکستان کا دور
مشن	کردار سازی، پاکستانیت کا فروغ
تاریخ وفات	۱۹ جون، ۱۹۹۹ء

گفتار و کردارِ سرسیّد

سعید راشد

سعید راشد ٹرسٹ

ضابطہ

حقوق تالیف	:	ہراس شخص عام کے نام جو سرسیّد کے مشن پر یقین رکھتا ہے۔
کتاب کا نام	:	گفتار و کردار سرسیّد
مؤلف	:	پروفیسر سعید راشد (علیگ)
مقصد تالیف	:	خصوصاً، کردار کے حوالے سے سرسیّد کے رول ماڈل کو اجاگر کرنا
مؤلف کے کوائف	:	سابق ایجوکیشن سیکرٹری سرسیّد میموریل سوسائٹی، اسلام آباد ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیچر ڈیولپمنٹ، سلطانہ فاؤنڈیشن، اسلام آباد
اہتمام	:	سعید راشد ٹرسٹ
رہائش	:	۳۴۹۔ سٹریٹ ۱۵، چکلالہ ۳، راولپنڈی فون ۵۵۹۰۸۵۷
اشاعت	:	سرسیّد کی صد سالہ برسی کے موقع پر

انتساب

ہر

شب گزیدہ

بستی کے

سرسیّد

کے نام

جو

اپنے حصے کا

دیا جلا رہا ہے!

کتاب
کا
پیغام

ہر بڑا کام
سب سے پہلے
بڑا کردار چاہتا ہے۔

ہر بڑا
آدمی
سب سے پہلے
بڑا
کردار
رکھتا ہے،
سچّا، کھرا،
سر سیّد
کی
طرح!

گفتار و کردارِ سرسیّد

بابِ اوّل

صبحِ زندگی

(قدریں اور رویئے)

باب دوم

آغازِ سفر

(گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان)

باب سوم

لندن میں قیام

(خبر و نظر میں یکتا)

باب چہارم

نقشِ قدم

(جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز)

باب پنجم

افکار و تاثرات

تتمہ

تعلیم کے حوالے سے

حُسنِ ترتیب

تعارفی مکالمہ

(ڈاکٹر غلام حسین اظہر اور پروفیسر سعید راشد کے مابین)

ڈاکٹر اظہر: پروفیسر صاحب، میں نے گفتار و کردار سرسیّد کے مسودہ کو ایک نظر دیکھا ہے۔ اس پر تبصرہ لکھنے سے پہلے میں بعض امور کی وضاحت چاہوں گا۔ مسودے کو ایک نظر دیکھتے ہی جو سوال میرے ذہن میں پیدا ہوئے، ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے قارئین کے ذہنوں میں بھی پیدا ہوں۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے تکنیکی امور پر کچھ گفتگو ہو جائے۔

سعید راشد: ضرور میں چاہوں گا کہ پہلے کتاب پر ضروری تعارفی گفتگو ہو جائے۔ میں نے اس کتاب کو بہت Involve ہو کر لکھا ہے۔

ڈاکٹر اظہر: اس میں کیا شک ہے کہ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اہم بلکہ بہت ہی اہم تالیف ہے۔ اس وقت ملک وقوم کو تعلیم و کیریکٹر کے حوالے سے سرسیّد کے رول ماڈل کی اشد ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے یہ منفرد کتاب ہے کہ اس میں بطور خاص سرسیّد کے عظیم کیریکٹر کو فوکس کیا گیا ہے۔ سرسیّد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور بقول حالی سرسیّد پر صدیوں لکھا جائے گا۔ لیکن اپنے موضوع کے لحاظ سے اور اپنے فوکس کے لحاظ سے یہ ایک منفرد کتاب ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ کسی اور کتاب میں اس طرح کی قدروں اور رویوں کو اجاگر کیا گیا ہو، وہ بھی ٹھوس واقعات کے حوالے سے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب سرسیّد پر ایک کیریکٹر ڈاکومینٹری کا مواد اپنے اندر رکھتی ہے۔ خدا کرے اس مواد پر مبنی کبھی ایک فلم بنائی جا سکے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہو گی۔

سعید راشد: ڈاکومینٹری کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

ڈاکٹر اظہر: اس کے Dramatic Dialogues سے۔ اس کتاب کے Format کی جدت قابل داد ہے۔ اور اس ضمن میں میرے کچھ سوال ہیں۔

سعید راشد: مثلاً؟

ڈاکٹر اظہر: پہلا سوال تو یہ ہے کہ کتابیں عموماً بیانیہ اسلوب میں لکھی جاتی ہیں۔ آپ نے یہ مکالماتی انداز کیوں اختیار کیا؟

سعید راشد: آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اس مکالماتی انداز میں قائداعظم علیہ الرحمۃ کے کردار پر ''گفتار و کردار قائداعظم'' اور اقبال کے افکار و کردار پر ''مکالمات اقبال'' بھی لکھی ہیں اور ان کا ''Feedback'' بہت اچھا ہے۔ اس طریق اظہار سے، جو سقراط کے نام سے منسوب ہے، نہ صرف دلچسپی قائم رہتی ہے۔ بلکہ اہم نکات کی باتوں باتوں میں وضاحت بھی ہوتی رہتی ہے۔ چونکہ مکالمے اور واقعات Situational ہوتے ہیں اس لئے ان میں ڈرامائی آب و رنگ آجاتا ہے۔

ڈاکٹر اظہر: میں نے آپ کی یہ دونوں کتابیں ''گفتار و کردار قائداعظم'' اور ''مکالمات اقبال'' بڑی دلچسپی سے پڑھی ہیں۔ مجھے ایک بار ڈاکٹر رحیم بخش شاہین (شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی) نے بتایا کہ ایم اے اقبالیات کے طلباء مکالمات اقبال کو بہت Quote کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ تحقیقی کتاب نہیں ہے، توضیحی کتاب ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مکالماتی انداز اس کی مقبولیت کا راز ہے۔

سعید راشد: ''گفتار و کردار قائداعظم'' کی صورت حال بھی ایسی ہے۔ اس سے Encourage ہو کر قائداعظم پر، میری نئی کتاب Character and Conduct of Quaid-e-Azam بھی اس مکالماتی اسلوب میں ہے۔

ڈاکٹر اظہر: آپ نے اس کتاب کیلئے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کا تو جواز ہے۔ لیکن زیرِ نظر کتاب ''گفتار و کردار سرسیّد'' کے حوالے سے میرا خاص سوال یہ ہے کہ اس تالیف کا بیشتر مواد ''حیات جاوید'' اور سرسیّد کی اپنی کتابوں سیرت فریدیہ، سفر نامہ مسافران لندن اور مکاتیب سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن آپ نے اس مواد کو حالی اور سرسیّد کے مکالمات کی شکل میں کس مصلحت سے ڈھالا ہے۔ اس کی اتھارٹی کیا ہے؟

سعید راشد: یہ سوال اس تعارف میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے میں ''حیات جاوید'' میں حالی کے دیباچے کی طرف رجوع کروں گا۔ مولانا الطاف حسین اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''راقم کو سرسیّد کے حالات لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت ہوا تھا جبکہ وہ اپنے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ مفید کام کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں قائم ہو چکا تھا۔ اور باوجود سخت مخالفت کے بہت تیزی سے ترقی کرتا جاتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ''تہذیب الاخلاق'' میں سرسیّد کی دلنشیں تحریریں جیسی کہ اردو زبان میں پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، شائع ہو رہی تھیں۔ اگرچہ سرسیّد نے اپنی زندگی بھلائی کے کاموں میں مدت سے وقف کر رکھی تھی۔ مگر ابھی تک اسکا حال پہلی رات کے چاند کا سا تھا کہ کسی نے دیکھا اور کسی

نے نہ دیکھا۔ لیکن ''مدرستہ العلوم'' اور ''تہذیب الاخلاق'' نے ان کی کوششوں کو چودھویں رات کی طرح روشن کر دیا۔ اگرچہ قوم میں عموماً مخالفت پھیلی ہوئی تھی۔ مگر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو سرسیّد کے کاموں کو نہایت عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ میرے دل میں بھی ان کی وقعت روز بروز زیادہ ہونے لگی۔''

ڈاکٹر اظہر: حالی نے بڑے انکسار سے کام لیا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ سرسیّد بھی حالی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سرسیّد کی فرمائش پر 70s میں حالی نے مسدس لکھی تھی جس کے متعلق سرسیّد کہا کرتے تھے کہ خدا روز محشر مجھ سے پوچھے گا کہ کوئی نیک کام بھی کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے ''مسدس مدو جزر اسلام'' لکھوائی تھی۔

سرسیّد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے بہترین مسلمان ذہنوں جیسے حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک اور وقار الملک کو متاثر کیا۔ اور ان کے تخلیقی اور عملی تعاون سے مسلمانوں کی قومی تحریک کو آگے بڑھایا۔

سعید راشد: میں حالی کو ''حیات جاوید'' کے دیباچے سے Quote کر رہا تھا۔ اس سلسلے کو شروع کرتا ہوں۔ حالی لکھتے ہیں کہ:

''اسی وقت سے (یعنی مدرستہ العلوم کی تاسیس کے وقت سے) میں نے کچھ نوٹ ان کی لائف کے متعلق قلم بند کرنے شروع کئے۔ اور کم وبیش سو سوال لکھ کر سرسیّد کے پاس بمقام علی گڑھ اس غرض سے بھیجے کہ ان کے جواب مختصر طور پر لکھ دیں۔ مگر کاپی ان کے پاس پڑی رہی۔ کسی سوال کا جواب وہاں سے نہ ملا۔ میں نے یہ بھی چاہا کہ برس چھ مہینے خود علی گڑھ جا کر رہوں جہاں اس کام کیلئے قیام نہایت ضروری تھا۔ مگر ملازمت کے تعلقات کی وجہ سے یہ موقع نہ مل سکا۔ کچھ عرصے کے بعد (۱۸۸۵ء میں) کرنل گریہم نے انگریزی میں سرسیّد کی مختصر لائف لکھی۔ اس کے بعد آنریبل حاجی محمد اسماعیل خان کے ایما اور تعاون سے منشی سراج دین مدیر چودھویں صدی نے سرسیّد کی لائف پر ایک مسودہ تیار کیا۔ جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ ان دو کاوشوں سے میرے دل میں پھر ایک ولولہ اٹھا کہ خدا کے فضل سے ایسے لوگوں کی کچھ کمی نہیں جو سرسیّد کے کاموں کی دل سے قدر کرتے ہیں ان کی خدمات کی داد دیتے ہیں ان کی بایوگرافی قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں۔ ان خیالات سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا، سب کام چھوڑ کر پہلے اس قومی فرض کو ادا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں اسی غرض سے میں نے چند ماہ علی گڑھ میں قیام کیا جہاں خود سرسیّد اور ان کی لائف لکھنے کا تمام سامان موجود تھا۔ اور اس کے بعد کئی دفعہ اس کام کیلئے وہاں جا جا کر رہنا پڑا۔''

اس طویل اقتباس سے میں یہ نتیجہ نکالنا چاہتا ہوں کہ ''حیات جاوید'' بے شک سرسیّد کی وفات کے چند سال بعد شائع ہوئی لیکن اس کا بیشتر بنیادی مواد حالی نے، بقول خود، براہ راست، سرسیّد سے اپنے تیار شدہ، سوسوا سو، سوالوں پر مبنی انٹرویو کے ذریعے حاصل کیا۔

ڈاکٹر اظہر: ایک فنکار کو اپنے Imagination کو اتنا تو کام میں لانا پڑتا ہے۔

سعید راشد: یہ مکالمے کی تیکنیک کا تقاضہ تھا کہ جواب سے پہلے سوال بھی لکھا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ سرسیّد کا کہا ہوا ہر لفظ Documental ہے۔ اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اظہر: اس امر کی ضرورت تھی کہ مکالمے کی صورت میں جو کچھ لکھا جائے وہ مصدقہ ہو۔

سعید راشد: اس ضرورت کو کما حقہٗ پورا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اظہر: اس وضاحت کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو اس Format پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ذاتی طور پر مجھے یہ جدت بہت اچھی لگی۔

سعید راشد: یہ کوئی تحقیقی، تاریخی کتاب نہیں ہے۔ اس کا مقصد ایک عام پڑھے لکھے پاکستانی تک سرسیّد کے رول ماڈل کو تعلیم اور کیریکٹر کے حوالے سے پہنچانا ہے۔

پاکستان کا سب سے گھمبیر مسئلہ کیریکٹر ہے۔ ایک Leading Role کے تین Dimensions ہوتے ہیں Vision، Values اور Will۔ ہر پاکستانی کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ عظیم الشان ہستی جس نے برصغیر میں مسلم قومیت کی بنیاد رکھی اس کا Vision کتنا بڑا تھا۔ اس کی Values کتنی مستحکم تھیں۔ اس کی Will کتنی مضبوط تھی۔ سرسیّد کی حیرت انگیز تاریخی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ فنافی القوم تھے۔ ان کی سب سے بڑی قوت سب سے مضبوط ڈھال ان کا خلوص، ان کا Devotion تھا۔ ان کے Vision اور Will اور ایک سسٹم کو قائم کرنے اور چلانے کی مافوق الفطرت مہارت نے انہیں پوری قوم کا Saviour بنا دیا۔

ڈاکٹر اظہر: پروفیسر صاحب! اس غیر معمولی کتاب کی اتنی خوبصورت اور موثر تالیف پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

سعید راشد: مجھے بھی اس پر ناز ہے۔ جب خدا پوچھے گا، زندگی میں کچھ کیا بھی؟ سر جھکا کے عرض کروں گا سیّد القوم سرسیّد پر ایک کتاب لکھی تھی۔

سر سیّد کے حضور

حالی: السلام علیکم، قبلہ سیّد صاحب!

سر سیّد: وعلیکم السلام، تشریف رکھیے۔

حالی: شکریہ! جیسا کہ میں نے خط میں لکھا تھا میں آپ کی بایوگرافی پر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔اس سلسلے میں کچھ دنوں یہاں رہ کر آپ سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

سر سیّد: میرے پاس اتنا وقت کہاں کہ اپنے بارے میں کچھ سوچوں۔

حالی: آپ کو شاید یاد ہو، اب (۱۸۹۴ء) سے پندرہ بیس سال پہلے بھی میں نے سوسوا سو سوالوں پر مبنی ایک کاپی آپ کو بھیجی تھی کہ آپ ان سوالوں کے مختصر جواب لکھ دیں تو قوم کا بھلا ہو۔

سر سیّد: قوم کے بھلے کی تو صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ جاگے اور تعلیم کے ذریعے اپنے آپ کو مضبوط بنائے۔ اپنے قومی وجود کو مستحکم کرے۔

حالی: اس عمل کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ قوم آپ کی لائف اور کاموں سے روشنی حاصل کرے۔

سر سیّد: آپ نے کرنل گریہم کی کتاب دیکھی ہوگی۔

حالی: میں نے یہ کتاب بھی دیکھی ہے۔منشی حاجی اسماعیل خان نے سراج دین کا مسودہ ازراہ کرم مجھے عطا کر دیا ہے۔ میں اس سے بھی استفادہ کروں گا۔لیکن میں جس پیمانے پر قوم کی بھلائی کیلیئے آپ کی لائف لکھنا چاہتا ہوں اس کے پھیلاؤ کا تقاضہ ہے کہ میں آپ سے براہ راست استفادہ کروں۔

سر سیّد: میں نے اپنے خاندان کے بارے میں اپنے نانا خواجہ فریدالدین کی مختصر بایوگرافی ''سیرت فریدیہ'' میں بہت کچھ لکھا ہے۔

حالی: قبلہ! ''سیرت فریدیہ'' کا ایک نسخہ آپ نے عطا کیا تھا۔ وہ میرے پاس ہے۔ میں اس سے بھی استفادہ کروں گا۔ آپ کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' بھی میں نے غور سے پڑھا ہے۔ لیکن آپ سے براہ راست معلومات حاصل کرنے کے علاوہ قوم کے بارے میں، کالج کے بارے میں، تعلیم و تربیت کے بارے میں آپ کے تصورات اور خیالات کو براہ راست ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس مبسوط اور مدلل بایوگرافی کی آپ کو ضرورت نہیں۔ لیکن قوم کو ہے۔ قوم کی موجودہ نسل بلکہ قوم کی آئندہ نسلیں بھی یہ حق رکھتی ہیں کہ وہ آپ کو، آپ کے کردار کو، آپ کے وژن اور مشن کو سمجھیں اور صدیوں تک روشنی حاصل کریں۔ کل میں اور آپ نہیں ہوں گے۔ لیکن یہ قوم تو ہوگی۔ یوں ہی چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

سرسیّد: اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جھنجھٹ قومی مفاد میں ہے تو بیشک بیڑہ اٹھایئے، آپ کی مرضی۔

حالی: میں چند ماہ یہاں رہوں گا۔ اور گاہے بگاہے آپ کو تکلیف دیتا رہوں گا۔ مجھے قوی امید ہے کہ قوم کی بھلائی کی کوئی ٹھوس صورت نکل آئے گی۔

سرسیّد: لیکن ایک شرط ہے، جو کچھ لکھنا ہے سچ لکھنا ہے، کسی کی کوئی رعایت نہیں کرنی۔ مجھے یا قوم کو کڑوی گولی کی ضرورت ہو تو ضرور دینی چاہیے۔ زندگی بھر یہی میرا اصول رہا ہے۔ حق گوئی و بے باکی۔ آپ کو میری جو بات بری لگی ہو، جس چیز پر تنقید مقصود ہو وہ بھی ضرور لکھیے گا۔ مزید برآں، اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی انصاف کرنا چاہیے۔ تہذیب الاخلاق میں برسوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہوں۔ یہ بھی ضرور دیکھیے گا۔

حالی: یقیناً میں آپ کی ہر تقریر اور ہر تحریر سے استفادہ کروں گا۔ قوم کو آپ کی، آپ کے وژن کی بڑی ضرورت ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

پیش لفظ

"Education does not merely mean academic education, you have to build the CHARACTER of your young generations which means highest sense of humour, integrity, selfless service to the nation and a sense of responsibility."

دنیائے علم وعمل میں، کبھی کبھی، اللہ تعالیٰ ایسے صاحب جنوں بندوں کو انسانیت کا پیغام پہنچانے کیلئے منتخب کرتا ہے جو، پیغمبروں کی پیروی کرتے ہوئے، اپنی زندگی نئی نسلوں کی آبیاری میں گزار دیتے ہیں۔ میری نظر میں جناب پروفیسر سعید راشد ایسے ہی تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر بریلی میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جو نہ صرف مسلمانان ہند کیلئے علم کا گہوارا اور درخشندہ اساتذہ کی آماجگاہ تھا بلکہ علم وعمل، کردار سازی، جدوجہد برائے قیام پاکستان اور درد و نورِ آرزومندی کی تحریک کا نام بھی تھا۔

یہ وہ تحریک تھی جو شاہ ولی اللہ کی تحریک جہاد سے شروع ہوئی، سرسیدؒ کی فہم وفراست کی بدولت دینی اور دنیاوی، دونوں تعلیمات کا احاطہ کرتے ہوئے اس تحریک نے دوقومی نظریئے کو اساس بنا کر مسلمانانِ ہند کو راہِ نجات پر گامزن کیا۔ دراصل اسی تحریک کو علامہ محمد اقبالؒ نے اپنی شاعری اور نثر،

(Reconstruction of Religious Thought in Islam)

دونوں کے ذریعہ اجاگر کیا۔ اور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں سیاسی طور پر واضح فرمایا۔ پھر، اسی تحریک اور قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت کے نتیجے میں ہمیں پاکستان جیسی گراں قدر نعمت ملی۔

علی گڑھ میں جناب سعید راشد نے جن نامور اساتذہ سے استفادہ کیا ان میں جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی اور جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خان کے نام سرفہرست ہیں۔ یہ نامور اساتذہ رشد و ہدایت کے وہ درخشندہ ستارے تھے جنہوں نے اپنے اس ہونہار طالب علم کو کردار سازی اور ملک وقوم کی بے لوث خدمت کی راہ پر لگایا۔ بھائی سعید راشد کی تمام زندگی کی جدوجہد اسی خدمت سے عبارت ہے۔

تقسیم ہند کے بعد بھائی سعید راشد، پاکستان کو ہاتھ میں صرف ایک چھوٹا سا تھیلا لئے تشریف لائے۔ لیکن انکے دل و دماغ میں آئندہ زندگی کا لائحہ عمل پختہ طور پر تشکیل پا چکا تھا۔ چنانچہ ترسیلِ علم کیلئے ملٹری کالج جہلم میں ۴۰ سال گزار دیئے۔

میرے بھائی سعید راشد علیگ نے سرسید کے بارے میں یہ اچھوتی کتاب جس منفرد انداز میں قلم بند

کی ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔ جب بھی میں ان کے پاس جاتا تو قلم لئے کردار سازی جیسے اہم موضوع کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھ رہے ہوتے۔ پھر سرسید یا کردار سازی کے حوالے سے گفتگو شروع ہو جاتی۔

انہوں نے سرسید کی قیادت کے اس وسیع میدان کا Value, Vision and Will کے ذریعے جس طرح احاطہ کیا ہے یہ انہی کا کمال ہے۔ دراصل یہ کتاب ''گفتار و کردار سرسید'' نہ صرف نصاب میں شامل اور ہر لائبریری کی زینت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس پر ایک فلم بنائی جانی چاہیے۔ تاکہ ہمارے پاکستانی نوجوانوں کی کردار سازی ہو سکے۔ دراصل ملتِ اسلامیہ کا مسئلہ فی الوقت اجتہاد کا ہے۔ اور اجتہاد کیلئے کردار سازی لازم ہے۔ دراصل یہی وہ نہایت اہم نقطہ ہے جس پر بھائی سعید راشد کی تمام تر توجہ مرکوز رہی۔ اور یہی ان کے علم و عمل کا حاصل ہے۔

بھائی سعید راشد جیسے باکمال اور بے لوث صاحبِ علم و فن کیلئے نواب بہادر یار جنگ نے کیا خوب کہا تھا:

> ''ہمیں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں۔ اور مٹی اور پانی میں ملکر رنگین پھول اور میٹھے پھل پیدا کرتے ہیں۔ ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کیلئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے رہ کر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔''

فقط

اقبال شفیع علیگ

صدر

سرسید میموریل سوسائٹی

اسلام آباد

جب خدا پوچھے گا

حق مغفرت کرے، راشد صاحب کو کبھی سپرد خاک نہ کر پاؤں گا۔ روز کسی نہ کسی حیلے بہانے، کسی نہ کسی کے سامنے ان کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یوں جیسے آسمان پر، ایک ایک کر کے، ستارے روشن کرنے کا کام ہو۔ میرا ایمان ہے کہ شب جس قدر تاریک ہوتی جائے گی، آسمان اتنا ہی روشن ہوتا چلا جائے گا۔ کہ قافلے کو آگے بڑھنا ہے۔

راشد صاحب کے ساتھ شاگرد رشید کی حیثیت سے، جو مکالمہ ملٹری کالج، جہلم میں ۱۹۶۰ء کی ایک صبح شروع ہوا، خود راشد صاحب نے تادمِ مرگ جاری رکھا۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ''گفتار و کردار قائد اعظم'' کے صفحات میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا، میاں یہ ذمہ داری تم سنبھالو......

مجھے احساس تھا کہ ان کی دیگر کتابوں کی طرح مجھے اس کتاب کے صفحات کو بھی ترتیب دینا تھا، کتابت کی غلطیاں درست کرنا تھیں۔ وغیرہ وغیرہ...... تاہم، دامن جھاڑ کر انہیں اٹھتے دیکھا تو محسوس ہوا کہ اب وہ اس سے بھی اہم کام کرنے چلے ہیں۔ بہرحال، اندازہ نہ تھا کہ کیا کرنے چلے ہیں، کس جنوں کو زنجیر کرنے۔

سچ تو یہ ہے کہ خود راشد صاحب ایسا جنوں تھے جنہیں زنجیر کرنا، کم از کم، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ انہوں نے انکشاف کیا کہ سر کرنے کو اگلی منزل سرسیّد احمد خان کی شخصیت ہے۔

میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ لیکن اس موضوع پر ان کے انٹرویو ریکارڈ کیے، ان کے لکھے ہوئے صفحات پڑھے تو محسوس ہوا کہ جن سے متعلق ہم نے نصاب کی کتابوں میں پڑھ رکھا ہے، ریڈیو، ٹیلی وژن پر سن رکھا ہے، یہ وہ سرسیّد تو قطعاً نہیں۔

بستر مرگ پر، جب وہ اپنے اہل خانہ اور تیمارداروں کے ہجوم میں گھرے ہوئے تھے، انہیں ایک ہی فکر ستاتی تھی۔ اس تکلیف کے عالم میں انہیں میری صورت نظر آتی تو اشاروں سے واضح کرتے کہ کتاب طباعت کیلئے پریس بھیج دوں۔ اپنی آنکھیں بند کیے گھنٹوں بے سدھ پڑے رہتے۔ لیکن جب میری آواز سنتے تو آنکھیں وا کر کے مجھے تلاش کرتے۔ اور پہچان کر کتاب سے متعلق ہدایات کیلئے اشارے کرنے لگتے۔

جنرل عبدالرزاق صاحب تیمارداری کیلئے اپنے استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو جہاں اپنی کچھ

کتابیں انہیں تحفے میں دیں، وہاں مجھے حکم ہوا کہ جنرل صاحب کی کار میں ان کے گھر، چکلالہ جاؤں۔ اوران کے کمرے کی فلاں میز پر سے خاکی کاغذ میں لپٹا، کتابوں کا ایک بنڈل اٹھالاؤں۔

بنڈل لیکر حاضر ہوا تو پوچھا، اب اس بنڈل کا کیا کروں؟ سرگوشی سی کرتے ہوئے، بمشکل، ایک لفظ ادا کر پائے۔

''............استفادہ!''

مئی ۱۹۹۵ء کی اس چبھتی دھوپ بھری دوپہر سے تادم تحریر، جہاں میں نے، حسب توفیق و ہدایات، ان ساری کتابوں سے استفادہ کیا وہاں کتاب کو ترتیب دیتے، کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کرتے، اور بلاوجہ تاخیر کے بعد اشاعت کیلئے پرنٹرز کے حوالے کرتے، مسلسل اس امر کا احساس بھی رہا کہ جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے، اس سے، جلد یا بدیر، سبکدوش ہونا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی مسدس کے متعلق سرسیّد فرمایا کرتے تھے کہ خدا روز محشر مجھ سے پوچھے گا کہ کوئی نیک کام بھی کیا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس مدوجزر اسلام لکھوائی تھی۔ پروفیسر سعید راشد مرحوم نے بھی اس غیر معمولی کتاب کی اتنی خوبصورت اور مؤثر تالیف پر ڈاکٹر غلام حسین اظہر کی مبارک باد وصول کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''جب خدا پوچھے گا، زندگی میں کچھ کیا بھی؟
سر جھکا کے عرض کروں گا،
سیّد القوم سرسیّد پر ایک کتاب لکھی تھی۔''

قارئین کرام!

جب خدا پوچھے گا تو نہایت عاجزی اور انکسار کے ساتھ میں بھی یہی عرض کروں گا کہ وہ اس کتاب کی ترتیب اور غلطیوں کی تصحیح کے حوالے سے میری عرق ریزی قبول فرمائے۔ آمین ثم آمین!

ہارون رشید
تعمیر ملت نیوز، شفا پبلیکیشنز،
شفا انٹرنیشنل ہسپتال، اسلام آباد
۱۵ نومبر ۲۰۰۲ء

حرف چند

مجھے اس کتاب کے علمی و ادبی مقام یا تاریخی اہمیت پر بات نہیں کرنا بلکہ میں صرف آپ کو دیئے روشن کرنے کے اس سفر میں شریک کرنا چاہتا ہوں جو ابا جی نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نصف صدی پہلے شروع کیا۔ اس سفر کا آخری پڑاؤ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ علی گڑھ نے ابا کو محمد سعید سے محمد سعید راشد بنایا۔ اور جو ذہنی تربیت کی وہ تاعمر ان کے ساتھ رہی۔ ملٹری کالج جہلم کے چالیس سال اور دو تعلیمی اداروں کی سربراہی سونے کو کندن بنا گئی۔ اس دوران ملٹری کالج کے جنگی اعزاز یافتگان، اقبال، قائداعظم اور لیڈر شپ کے موضوع پر بیس سے زائد کتب منظر عام پر آئیں۔ ۱۹۹۰ میں ملٹری کالج چھوڑنے کے بعد ان کا رابطہ پاکستان کے عمومی تعلیمی اداروں سے ہوا۔ یہاں بنیادی سطح پر بچوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت اور کردار سازی اور اس ذیل میں اساتذہ کی اہمیت کا احساس دو چند ہوا۔ پھر زندگی کے آخری لمحے تک یہی ان کا میدانِ عمل بن گیا۔ ۱۹۹۴ میں راولپنڈی آنے کے بعد محترم اقبال شفیع اور دوسرے علیگ احباب سے تجدید ملاقات ہوئی۔ اور علی گڑھ کا وہ شعلہ جو ہمیشہ ہی ان کے دل میں رہا تھا اب روشن تر ہو گیا۔ سرسید کا پیغام اب نشان منزل نہیں بلکہ منزل بن گیا۔ اسی دور میں یہ احساس بھی ہوا کہ سرسید کو اس طرح پڑھا اور سمجھا نہیں گیا جیسا انکا حق اور ہماری ضرورت ہے۔ پاکستان کی فکری بنیاد رکھنے والی اس شخصیت کی سوچ اور اپروچ کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ''گفتار و کردار سرسید'' لکھی گئی ہے۔

یہ ابا کی زندگی کی آخری کتاب ہے جو وہ مکمل کر سکے۔ دوسرے ڈرافٹ کے قلمی نسخے کو ترتیب دے کر قابلِ اشاعت صورت دینے کیلئے میں محترم ہارون رشید صاحب کا شکر گزار ہوں یہ ان ہی کی کاوش ہے جو یہ کتاب آج آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

دعاؤں کا طالب

آصف سعید راشد

راولپنڈی

۱۹ جون، ۲۰۰۳ء

باب اوّل

صبحِ زندگی

(قدریں اور رویے)

شخصیت کی تشکیل
قوم کے مصلح، مفکر، مدبر اور مربی
سر سیّد احمد خان
کی
حیات جاوید
کا
تشکیلی دور

آباء واجداد

سلسلۂ نسب

حالی: انسانی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثر اس کی اصل، نسل اور آباء واجداد کے کارناموں اور کردار کا بھی ہوتا ہے۔ اور اس ماحول کا بھی جس میں کوئی انسان آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے۔

سرسیّد: ہاں، یہ تو ہے۔

حالی: تو قبلہ، اس نکتہ کے تحت میں آپ سے گزارش کروں گا کہ سب سے پہلے اپنے آباء واجداد کے بارے میں کچھ بتائیے۔

سرسیّد: والد ماجد کی طرف سے میں حسینی سیّد ہوں۔ میرا سلسلہ نسب ۳۶ واسطوں سے حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی تک پہنچتا ہے۔ میرے آباء و اجداد اموی اور عباسی خلفاء کے زمانوں میں عرب سے ہجرت کر کے ہرات اور ایران آباد ہوئے۔ پھر عہد شاہجہانی میں دہلی، ہندوستان آ گئے اور بہت جلد اپنے علم و فضل کی بنا پر مغل دربار میں رسوخ اور اعزاز حاصل کر لیا۔ میرے دادا سیّد ہادی، پہلے عالمگیر ثانی، پھر شاہ عالم کے دربار سے وابستہ رہے اور جاگیر و خطابات سے سرفراز ہوئے۔ میرے دادا سیّد ہادی منجملہ اور خوبیوں کے، فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کا پورا دیوان ان کے ہاتھوں کا لکھا ہوا میرے پاس موجود تھا جو غدر کے زمانے میں تلف ہو گیا۔ میرے والد جناب میر متقی صاحب کا بھی دربار وقلعہ سے تعلق رہا۔

والدین

حالی: اپنے والدین کا کچھ تعارف کرانے کی زحمت کیجیے۔

سرسیّد: میرے والد میر متقی ہر چند کہ شاہ عالم اور پھر اکبر شاہ ثانی کے دربار خاص میں آتے جاتے تھے، دربار میں ان کا بڑا رتبہ تھا۔ میں بارہا اپنے والد صاحب کے ساتھ اور پھر تنہا بھی دربار خاص میں گیا ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صوفی منش، درویش صفت اور آزاد طبیعت انسان تھے۔ ان کا موروثی مکان جامع مسجد کے مشرق دروازے کے قریب تھا۔ نادر گردی اور مرہٹہ گردی میں لٹ چکا تھا اور اس کے اکثر حصے منہدم ہو گئے تھے۔ تادم آخر ٹوٹے

ہوئے گھر میں رہتے رہے۔ والد کی ننھیال (مشہور صوفی بزرگ اور شاعر) خواجہ میر درد کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی۔ غالبًا اسی تعلق سے والد حضرت شاہ غلام سے، جن کی خانقاہ دلی میں ہے، بیعت تھے۔ حضرت شاہ صاحب قبلہ ان پر پدرانہ شفقت فرماتے تھے۔ شاہ صاحب ان پر اتنا کرم فرماتے تھے کہ ان کے ایماء پر ہر روز حلقہ کے بعد شاہ صاحب کا ایک مرید خاص والد کی ڈیوڑھی پر ان کی خیر خیریت دریافت کرنے آتا تھا۔ اور اگر ان کے ہاں کوئی بیمار ہو جاتا تو شاہ صاحب کے خلیفہ اور مرید خاص مرزا عبدالغفور صاحب ان کے علاج کیلئے بنفس نفیس آتے تھے۔ اور جب تک مریض کو صحت نہ ہو جائے، برابر آتے رہتے تھے۔ ان کو بھی اپنے مرشد شاہ صاحب سے اتنی ہی عقیدت تھی۔ جب شاہ صاحب کا وقت آخر آیا اور انہوں نے اپنی قبر مرزا جانجاناں کی قبر کے پاس کھدوانے کا عندیہ دیا تو والد نے ان سے عرض کیا کہ حضرت، مجھے اجازت عطا ہو کہ اپنا وقت آنے پر میں آپ کے مرقد کے پائنتی دفن ہوں۔ اور حضرت نے بخوشی اپنی رضا کا اظہار کیا۔ چنانچہ والد شاہ صاحب کی قبر کی پائنتی دفن ہیں۔

حالی: آپ کے والد میر متقی کی برگزیدگی تو مسلم ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کوئی اور خصوصیت جس کا نقش آپ کے دل پر ہو؟

سرسیّد: ایک تو یہ کہ وہ ایسے صوفی اور درویش نہیں تھے کہ دنیا بالکل ہی تج دی ہو۔ اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیراندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے۔ چنانچہ والد میر متقی کو بھی ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا۔ قلعہ معلّٰی کے اکثر مرشد زادے اور شہر کے شریف زادے ان دونوں فنون میں ان کے شاگرد تھے۔ میرے ماموں نواب زین العابدین خان جو قطع نظر تیراندازی کے تیراکی میں بھی نہایت مشاق تھے، والد ہی کے شاگرد تھے۔ خود میں نے بھی تیراکی اور تیراندازی انہی سے سیکھی تھی۔

حالی: قبلہ، یہ تو فنی شاگردی ہوئی۔ آپ نے والد سے کچھ اور بھی سیکھا؟

سرسیّد: میں بتا چکا ہوں، وہ مال و دولت سے بے نیاز ایک غنی النفس انسان تھے۔ منجملہ اور خوبیوں کے ان کی وضع داری اور راست بازی کا نقش میرے دل پر باقی ہے۔

حالی: اس کی کوئی مثال؟

سرسیّد: جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا تھا، معین الدین اکبر شاہ سے ان کی شہزادگی کے زمانے میں بڑی یاد اللہ تھی، بلکہ بے تکلفی تھی۔ ان کے ایک بھائی تھے مرزا شمس الدین جن سے امور سلطنت اور معاملات ملک و جائیداد پر کچھ اختلاف تھا۔ جس کے باعث دونوں بھائی ایک

دوسرے سے نہیں ملتے تھے۔ بدیں وجہ ایک دوسرے کے متوسلین بھی ایک دوسرے سے پہلوتہی کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ والد میر متقی کے خلوص کے تعلقات مرزا شمس الدین سے تھے۔ وہ ان کے ہاں بھی تواتر سے آتے جاتے تھے۔ خود مرزا شمس الدین ان سے بہت خلوص برتتے تھے۔ ان کو اپنے مسند کے پاس بٹھاتے تھے۔ اور اپنا ٹھنڈا پینے کو عنایت کرتے تھے۔ ہوا یوں کہ حاسدوں نے معین الدین اکبر شاہ کے کان بھرے کہ میر متقی تو مرزا شمس الدین کے ہاں آتے جاتے ہیں۔ اور ان سے خصوصی روابط رکھتے ہیں۔ اکبر شاہ نے اشارتاً کنایتاً انہیں مرزا شمس الدین سے ملنے سے منع کیا۔ والد نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ کیا حضور کو فدوی کی جانثاری میں کچھ تردد ہوا ہے؟ بادشاہ نے ہنس کر فرمایا، نہیں۔ تو یہ بولے تو میں اپنی وضع داری کو چھوڑ کر مفت میں کیوں روسیاہی مول لوں۔ بادشاہ یہ سن کر چپ ہو رہے۔ پھر انہوں نے اس مسئلے کو نہیں چھیڑا۔ اور والد بدستور مرزا شمس الدین سے ملتے رہے۔

حالی: سبحان اللہ! بہت وضع دار اور راست باز انسان تھے۔

سرسیّد: جو کچھ بھی وضع داری، راست بازی اور غنی النفسی میرے اندر ہے، یہی میرے والد کی دین تھی۔

حالی: اگر اجازت دیں تو کچھ باتیں آپ کی والدہ مکرمہ کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ جیسا کہ آپ نے سیرت فیریدیہ میں لکھا ہے کہ آپ کی اصل مربیہ تو وہ ہیں۔

سرسیّد: اصل میں میری پرورش، پرداخت اور اٹھان میں میرے ننھیال کا اتنا عمل دخل ہے کہ پہلے میرے ننھیال کا ذکر ضروری ہے وہ آپ سیرت فریدیہ سے لے لیجیے گا۔

حالی: سیرت فریدیہ میں دیکھ چکا ہوں۔ لیکن آپ سے براہ راست معلومات حاصل کرنے سے کچھ اور ضروری پہلو بھی سامنے آ جائیں گے۔

سرسیّد: آپ دیکھ رہے ہیں جب (۱۸۹۵ء) سے کالج کے ہیڈ کلرک شام بہاری لال کے غبن کا واقعہ ہوا ہے میری صحت خراب رہنے لگی ہے۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے دو چار نشستوں میں جلد پوچھ لیجئے۔

میرے نانا فریدالدین احمد میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان ہی کے حوالے سے میں نئے دور کا تقاضوں سے آشنا ہوا۔ اگر ان کی مثال سامنے نہ ہوتی تو میں شاید ۱۸۳۸ء میں سرکاری ملازمت میں آنے کا فیصلہ نہ کرتا۔

خواجہ فریدالدین احمد خواجہ محمد یوسف ہمدانی کی اولاد میں سے تھے۔ اول ان کے دادا خواجہ

عبدالعزیز بعنوان تجارت کشمیر سے دلی آئے تھے۔ وہ کشمیری شالوں کے تاجر تھے اور یہیں دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ نانا کے والد خواجہ محمد اشرف کشمیری شالوں کی تجارت کرتے تھے۔ خواجہ اشرف کے آٹھ بیٹوں میں سے نانا خواجہ فریدالدین احمد نے تجارت ہی نہیں علم اور سفارت کاری میں بھی شہرت حاصل کی۔ وہ ریاضیات کے حوالے سے وحید عصر تھے۔ انہوں نے لکھنو جا کر علامہ فضل حسین سے ریاضی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ رصد اور آلات رصد بنانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ بہت سے اہل علم نے ان سے ریاضی میں اکتساب کمال کیا۔ ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ زین العابدین خان جو ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، وہ انہی کے شاگرد تھے۔ مزید برآں فن موسیقی میں استادانہ مہارت رکھتے تھے۔

ریاضیات کے علاوہ میرے نانا حکمت عملی میں بھی طاق تھے۔ انہوں نے سرکار انگریزی کی طرف سے ایران اور برما میں کامیاب سفارت کاری کی۔ نوابانِ اودھ اور اکبر ثانی سے ان کے رابطے رہے۔ دربار میں بھی بحیثیت وزیر مال خدمات انجام دیں۔ اور اس حوالے سے دبیر الملک، امین الملک اور مصلح جنگ کے خطابات سے سرخرو ہوئے۔ انہوں نے اپنے ایام وزارت میں بادشاہ کو قرضوں سے نجات دلانے کا بندوبست کیا۔ ان میں انتظامی صلاحیت اور سفارت کاری کی فراست غیر معمولی تھی۔ منجملہ ان کمالات کے وہ صوفی منش بھی تھے۔ صوفیا کے ایک مسلک سے بھی وابستہ تھے۔

حالی: آپ نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین احمد سے براہ راست کوئی فیض اٹھایا؟

سرسیّد: میں انہی کے گھر پیدا ہوا تھا۔ ان کا انتقال ۱۸۲۸ء میں ہوا۔ میں نے بچپن کے دس گیارہ سال انہی کے زیر سایہ گزارے۔ سیرت فریدیہ میں میں نے ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کی علم دوستی اور سفارت کاری کی سرگرمیوں میں میری آنکھیں کھلیں۔

حالی: آگے چل کر آپ نے قلعے کی ملازمت پر انحصار کرنے کی بجائے حکومت وقت کے محکمہ انصاف سے وابستہ ہونے کا جو فیصلہ کیا اور بعد میں جو علمی سرگرمیاں اختیار کیں، کیا وہ آپ کے نانا کا اثر تھا؟

سرسیّد: یقیناً وہ میرے پہلے ہیرو تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں کیلئے ایک تاریخ ساز لمحہ

سرسیّد کی پیدائش

حالی: آپ کی تاریخ پیدائش؟

سرسیّد: میں ۵ ذی الحج ۱۲۳۲ھ اور بمطابق سنہ عیسوی ۱۷ اکتوبر کی صبح اپنے نانا کی حویلی میں پیدا ہوا۔ حضرت غلام علی شاہ نقشبندی ایک عارف باللہ بزرگ نے میرے کان میں اذان دی۔

حالی: اور نام کس نے رکھا؟

سرسیّد: میرے بڑے بھائی کا نام محمد شاہ بھی انہی نے رکھا تھا۔ میرا نام احمد بھی انہی نے رکھا۔

بچپن میں قد کاٹھ

حالی: جو لوگ دنیا میں غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر جسمانی اعتبار سے بھی مضبوط اور توانا ہوتے ہیں۔ قبلہ آپ کی جسمانی قدوقامت بھی قابل رشک ہے۔

سرسیّد: اب کہاں! کبھی تھی۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ میں اپنے خاندان کے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ قوی، توانا اور ہاتھ پاؤں سے مضبوط تر پیدا ہوا تھا۔ جب میرے نانا خواجہ فریدالدین احمد دوسری بار کلکتہ سے دلی میں آئے اور مجھے پہلی بار دیکھا تو کہا۔

''یہ تو ہمارے گھر میں جاٹ پیدا ہوا ہے۔''

حالی: بچپن کی کوئی اور یاد آپ کے ذہن میں محفوظ ہو۔

سرسیّد: ہمارے گھرانے کی ایک قدیم خیرخواہ خادمہ ''مان بی بی'' تھی جس نے مجھے پالا تھا۔ مجھے مان بی بی سے بہت محبت تھی۔ میں پانچ برس کا تھا جب مان بی بی کا انتقال ہوا۔ مجھے یاد ہے مان بی بی مرنے سے چند گھنٹے پہلے فالسے کا شربت مجھ کو پلا رہی تھی۔ جب وہ مر گئی تو مجھے اس کے مرنے کا بہت رنج ہوا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا کہ وہ خدا کے پاس گئی ہے، بہت اچھے مکان میں رہتی ہے، بہت سے نوکر چاکر اس کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اس کی زندگی بہت آرام سے گرزتی ہے۔ تم کچھ رنج مت کرو۔ مجھ کو ان کے کہنے سے پورا یقین تھا کہ فی الواقع ایسا ہی ہے۔ مدت تک ہر جمعرات کو اس کی فاتحہ ہوا کرتی تھی۔ اور کسی محتاج کو کھانا دیا جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ سب کھانا مان بی بی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مرتے

وقت کہا تھا کہ میرا تمام زیور سیّد کا ہے۔ مگر میری والدہ اس کو خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ اگر تم کہو تو یہ گہنا ماں بی بی کے پاس بھیج دوں۔ میں نے کہا ہاں بھیج دو۔ والدہ نے وہ گہنا مختلف طرح سے خیرات میں دے دیا۔

سچی بات یہ ہے کہ میرے بچپن میں جسمانی صحت اور فزیکل قابلیت کے سوا مجھ میں کوئی ایسی خصوصیت جس سے بچپن کو معمولی لڑکوں کے بچپن پر بے تکلف فوقیت دی جا سکے، نہیں پائی جاتی تھی۔ یعنی جیسے کہ بعض بچے ابتداً میں نہایت ذکی اور طباع اور اپنے ہمجولیوں میں سب سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ مجھ میں کوئی اس قسم کا صریح امتیاز نہ تھا۔ میں نے اپنے قوئ ذہنیہ کو محض دماغی ریاضت اور لگاتار غور و فکر سے بتدریج ترقی دی تھی۔ اسی لئے میری لائف کا آغاز معمولی آدمیوں کی زندگی سے کچھ زیادہ چمکدار معلوم نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوں وہ برسوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے بعض حکماء کی رائے یہ ہے کہ محنت سے آدمی جو چاہے سو ہو سکتا ہے۔

(حیاتِ جاوید، حالی، صفحہ ۵۱)

رسم بسم اللہ اور ابتدائی تعلیم

سرسیّد کے زمانے میں مسلمان بچوں کی رسمی تعلیم کی ابتدا چار سال چار ماہ چار دن کی عمر میں ایک رسم سے شروع ہوتی تھی جسے بسم اللہ کہتے تھے۔

حالی: قبلہ، آپ کی بسم اللہ کب اور کس کے ہاتھوں ہوئی؟

سرسیّد: مجھے اپنی بسم اللہ کی تقریب بخوبی یاد ہے۔ ہمارے گھر میں کثرت سے لوگ جمع تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ خصوصاً حضرت شاہ غلام علی صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ مجھ کو لا کر حضرت کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ میں اس مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا سا ہو گیا۔ میرے سامنے تختی رکھی گئی۔ اور غالباً شاہ صاحب ہی نے فرمایا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

مگر میں کچھ نہ بولا اور حضرت کی طرف دیکھتا رہا۔ انہوں نے مجھے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اور فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ کر پڑھیں گے۔ اور اول بسم اللہ پڑھ کر اقراٗ کی اول آیتیں مالم یعلم تک پڑھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھتا گیا۔ بسم اللہ ہونے کے بعد میں نے قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔

حالی: قرآن شریف آپ نے کس سے پڑھا؟

سرسیّد: میری ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی رہتی تھی۔ میں نے بھی ایک استانی سے جو ایک اشراف گھرانے کی پردہ نشین بی بی تھیں، سارا ناظرہ قرآن پڑھا۔

میرے قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو اس زمانے میں ہوتی تھی وہ اس قدر عجیب اور دلچسپ تھی کہ پھر کبھی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی۔ قرآن ختم کرنے کے بعد میں گھر سے باہر مکتب میں پڑھنے لگا۔

حالی: آپ کی مزید تعلیم کہاں اور کیسے ہوئی؟

سرسیّد: پہلے گھر کے اتالیقوں سے فارسی اور عربی پڑھی۔ شروع شروع میں مجھے پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ ریاضی اور علم ہیئت ننھیال کی طرف سے ہمارے خاندانی علوم تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنے ماموں زین العابدین خان سے حاصل کی۔ طب یونانی کی باقاعدہ تحصیل کی۔ چند ماہ مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب میں نے رسمی طور پر پڑھنا چھوڑا میری عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ گو اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعے کا شوق رہا۔ اس وقت

دلی میں جو ذی علم اصحاب تھے جیسے صہبائی، غالب، آزردہ وغیرہ، ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا اکثر موقع ملتا رہا۔۱۸۶۴ء میں جب میں فتح پورسیکری تبدیل ہوکر دلی کی منصفی پر آیا تو ایک بار پھر میں اپنی رسمی تعلیم کو مکمل کرنے میں منہمک ہو گیا۔

قلعہ معلیٰ میں حاضری

حالی: آپ کے والد کا قلعہ معلیٰ میں آنا جانا تھا۔کبھی آپ کو وہاں حاضری دینے کا اتفاق ہوا؟

سرسیّد: والد گرامی کو اکبر شاہ کے زمانے میں ہر سال جلوس کے جشن پر پانچ پارچہ اور تین رقوم جواہر کا خلعت عطا ہوتا تھا۔آخر آخر میں انہوں نے دربار کا جانا کم کر دیا تھا۔اور باوجودیکہ میری عمر کم تھی، اپنا خلعت مجھے دلوانا شروع کر دیا تھا۔

حالی: آپ کو دربار کی کوئی حاضری یاد ہے؟

سرسیّد: ایک بار خلعت ملنے کی تاریخ پر ایسا اتفاق ہوا کہ والد صاحب بہت سویرے اٹھ کر قلعہ چلے گئے۔اور میں بہت دن چڑھے اٹھا۔ ہر چند بہت جلد گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا مگر پھر بھی دیر ہو گئی۔ جب لالِ پردہ کے قریب پہنچا تو قاعدہ کے موافق اول دربار میں جا کر آداب بجا لانے کا وقت نہیں رہا تھا۔ داروغہ نے کہا کہ بس اب خلعت پہن کر ایک ہی دفعہ دربار میں جانا جب خلعت پہن کر میں نے دربار میں جانا چاہا تو دربار برخاست ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ تخت پر سے اٹھ کر ہوادار پر سوار ہو چکے تھے۔بادشاہ نے مجھے دیکھ کر والد سے جو اس وقت ہوادار کے پاس ہی تھے، پوچھا کہ ''تمھارا بیٹا ہے؟'' انہوں نے کہا ''حضور کا خانہ زاد!'' بادشاہ چپکے ہو رہے۔لوگوں نے جانا کہ بس اب محل میں چلے جائیں گے۔مگر جب تسبیح خانہ میں پہنچے تو وہاں ٹھہر گئے۔تسبیح خانہ میں بھی ایک ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جہاں کبھی کبھی دربار کیا کرتے تھے۔اس چبوترہ پر بیٹھ گئے اور جواہر خانہ کے داروغہ کو کشتی جواہر حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ بادشاہ نے مجھے اپنے سامنے بلایا اور کمال عنایت سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر فرمایا ''دیر کیوں کی؟'' حاضرین نے کہا، عرض کرو کہ ''تقصیر ہوئی۔'' مگر میں چپکا کھڑا رہا۔ جب حضور نے دوبارہ پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ ''سو گیا تھا۔'' بادشاہ مسکرائے اور فرمایا کہ ''بہت سویرے اٹھا کرو۔'' اور ہاتھ چھوڑ دیے۔ لوگوں نے کہا، آداب بجا لاؤ۔ میں آداب بجا لایا۔ بادشاہ نے جواہرات کی معمولی رقمیں اپنے ہاتھ سے پہنائیں۔ میں نے نذر دی اور بادشاہ اٹھ کر خاصی ڈیوڑھی سے محل میں چلے گئے۔تمام درباری میرے والد کو بادشاہ کی اس عنایت پر مبارک سلامت کہنے لگے۔اس زمانے میں میری عمر آٹھ نو برس کی ہو گی۔

(حیات جاوید، صفحہ۵۱)

عظیم بیٹے کی عظیم ماں

سرسیّد کی والدہ ماجدہ

حالی: قبلہ، آپ کا قول ہے کہ ایک اچھی ماں ہزار استادوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اور آپ کی تربیت، آپ کے بقول، آپ کی والدہ ماجدہ کے ہاتھوں ہوئی۔ اس لئے اب کچھ ان کے بارے میں بھی ارشاد ہو۔

سرسیّد: یقیناً ایک اچھی ماں ہزار استادوں پر بھاری ہوتی ہے۔ اور میری ماں ایک ایسی ہی نایاب ماں تھیں۔ میری والدہ عزت النساء بیگم میرے نانا کی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ اور غیر معمولی فہم وفراست کی مالک تھیں۔ میرے نانا اپنے معاملات میں اپنی اولاد میں سب سے زیادہ ان سے مشورت پر اعتماد کرتے تھے۔

حالی: اس امر کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہے؟

سرسیّد: میں پہلے بتا چکا ہوں کہ سفارت کاری میں ان کی مہارت اس پائے کی تھی کہ سرکار انگریزی اور قلعہ معلیٰ نے کئی بار ان کی فراست صلاحیت سے اور انتظامی استفادہ کیا۔ پٹیالے کی ریاست میں بھی ان کا اثر ورسوخ تھا۔ جب مہاراجہ نے ان سے کسی ریاستی مسئلے میں مشورت کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ ہی زادِ راہ بھی بھیجا تو نانا میری والدہ کے کہنے پر لاہور نہیں گئے اور معذرت کے ساتھ زادِ راہ واپس کر دیا۔ میں نے اس واقعے کا ''سیرت فریدیہ'' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ والدہ مکرمہ غیر معمولی فہم وفراست کی مالک تھیں۔ کچھ خواتین گھر بلکہ خاندان کو بنانے والی ہوتی ہیں۔ والدہ واقعی عزت النساء تھیں۔

کریم النفس ماں

حالی: خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اچھی مائیں میسر آئیں۔ بلاشبہ آپ کی والدہ ماجدہ بہت عظیم خاتون تھیں۔ ان کی شخصیت کا کوئی اور پہلو جس نے آپ کے دل پر گہرا اثر کیا ہو؟

سرسیّد: میں ان کی کریم النفسی کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا۔ ان کی چند خاص عادتوں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ محلے پڑوس کی لاوارث بوڑھی عورتوں کی خبر گیری کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ ہمارے زنانہ مکان سے باہر بطور جلو خانہ ایک میدان تھا۔ اس کے ایک طرف متعدد کوٹھریاں

دریکدرے ملازموں کے رہنے کیلئے بنے ہوئے تھے۔ والدہ غریب لاوارث بوڑھی عورتوں کو
ان یک دروں میں رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک بڑھیا زبین کا ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔

حالی: کیا؟

سرسیّد: اتفاقاً ایک زمانے میں میری والدہ اور زبین ایک ساتھ بیمار ہوئیں۔ مزید یہ کہ دونوں کی بیماری کی نوعیت بھی کم وبیش یکساں تھی۔ چنانچہ جو دوا والدہ کیلئے آتی تھی اس میں کچھ وہ پہلے زبین کو کھلاتی تھیں۔ مزید تقویت کیلئے حکیم صاحب نے والدہ کیلئے مروارید کی بہت قیمتی معجون تجویز کی۔ میں اس زمانے میں دلی میں منصف تھا۔ میں نے جواہر مروارید کی وہ قیمتی معجون تیار کروا کر والدہ کی خدمت میں پیش کی۔ معجون کی مقدار اتنی تھی کہ جو ایک ہی مریض کیلئے مطلوبہ دنوں کے لئے کافی ہوسکتی تھی۔ والدہ نے مجھ سے تو مزید معجون بنوانے کی فرمائش نہیں کی لیکن از خود یہ فیصلہ کیا کہ معجون خود نہ کھائیں بلکہ زبین کو ہر روز اہتمام سے وقت پر اپنے ہاتھ سے کھلائیں۔ کچھ دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ والدہ بہت چاق و چوبند ہوگئی ہیں اور ان کے چہرے کی رونق لوٹ آئی ہے۔ میں بہت خوش ہوا۔ ایک دن میں نے کہا۔ مبارک ہو۔ معجون نے آپ کو بہت فائدہ پہنچایا۔ آپ کی صحت بہت بہتر ہوگئی ہے۔ وہ ہنس پڑیں۔ بولیں "احمد، تیرا کیا خیال ہے صحت معجونیں دیتی ہیں۔ صحت اللہ دیتا ہے جو نیتوں کو دیکھتا ہے اور دلوں کے بھید بہتر جانتا ہے۔"

پھر کہنے لگیں۔ "احمد، زندگی نیت کا کھیل ہے۔ اللہ کریم کے فضل و کرم کی کوئی حد نہیں ہے، جو جسے چاہے، جس حیلے سے چاہے عطا کرے۔"

پھر انہوں نے مجھے اصل صورتحال سے آگاہ کیا۔

حالی: اللہ اکبر، اللہ کریم ان کو غریق رحمت فرمائے۔ کیا سبق دے گئیں۔

(سیرت فریدیہ بحوالہ مقالات سرسیّد جلد شازدہم، صفحہ ۶۸۵)

ایک نایاب نصیحت

حالی: بلاشبہ آپ کی والدہ مکرمہ آپ کی عظیم مربی تھیں۔

سرسیّد: والدہ کی تربیت کا دائرہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط تھا۔

حالی: کیا آپ کے ذہن میں کوئی خاص واقعہ ہے؟

سرسیّد: بتاتا ہوں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں دہلی میں تعینات تھا۔ ایک ایسے شخص نے جس پر میرے بڑے احسانات تھے، نامعلوم وجوہ کی بنا پر میرے خلاف سازشیں شروع کیں۔ اور مجھے میرے کاموں میں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اتفاق کی بات

کہ اس کے کرتوتوں کے حتمی ثبوت میرے ہاتھ لگ گئے۔ جن کی بنا پر فوجداری عدالت سے اسے قرار واقعی سزا ہو سکتی تھی۔ میرے نفس نے مجھے اکسایا کہ میں انتقام لینے کے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دوں۔ اس صورت حال کا برسبیل تذکرہ والدہ کے سامنے آ گیا۔ وہ یہ سن کر تڑپ اٹھیں۔ کہنے لگیں:

''احمد، مجھے توقع نہیں تھی کہ تم بھی عام آدمیوں کی طرح انتقام لینے کے بارے میں کبھی سوچو گے۔ تمھیں معلوم ہے عفو و درگزر کا ہمارے دین میں کیا مقام ہے۔ ہمارا رب طاقت رکھتے ہوئے معاف کر دینے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔ ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ ہے۔ جو کچھ اس نے کیا، کیا۔ اس کا کیا دھرا اس کے ساتھ قبر میں جائے گا۔ تمھارا حسن سلوک تمھارا عمل ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم اس بدقسمت شخص کو سچے دل سے معاف کر دو۔''

میں نے پوچھا، آپ اسے بدقسمت کیوں کہہ رہی ہیں۔

فرمایا، احمد! احسان فراموشی، محسن آزاری کی بدقسمتی نہیں تو کیا ہے۔ بہرحال اگر تم فی الواقع اس سے انتقام لینا چاہتے ہو تو فوجداری عدالت کے بہت حقیر حاکم سے سزا دلوانے کی بجائے اس احکم الحاکمین، رب العالمین کے سامنے پیش کر دو، قرار واقعی سزا دلواؤ جو ابدالآباد تک جاری رہے۔ اور تمھارے جذبہ انتقام کی کما حقہٗ تسکین ہو۔

حالی: بہت بڑی بات کہی۔

سرسیّد: والدہ کی یہ دلیل سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ باتیں انہوں نے کچھ اتنی دلسوزی سے کہیں کہ انتقامی یا جوابی کارروائی نہ صرف میں نے واپس لے لی۔ بلکہ یہاں اور عقبیٰ دونوں جگہ اس کو معاف کر دیا۔ یہ بات چالیس سے اوپر کی ہے جب میں اپنی ملازمتی زندگی کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ پچھلے پچیس تیس سال سے جب میں تعلیم کے ذریعے نظام کی اصلاح اور تعمیر کے خارزار میں الجھا ہوا ہوں تو بیسیوں ایسے مواقع آئے۔ مجھے اپنوں اور غیروں کی مخالفتوں بلکہ دشمنیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں الحمدللہ والدہ معظمہ کی نایاب نصیحت پر کاربند رہا۔ اور عفوودرگزر کی راہ پر قائم رہا۔ اور اس رویے سے مجھے اور میرے مشن کو بہت تقویت ملی۔ یہ سب والدہ مکرمہ کے فیض تربیت کے اثرات ہیں۔ اللہ جل شانہٗ ان کی قبر کے ہر گوشے کو اپنی رحمت سے ٹھنڈا رکھے۔

حالی: میں خود حیران تھا کہ اپنے مخالفوں اور حریفوں سے آپ کا اتنے عفوودرگزر کا سلوک کیوں ہے، آج وہ راز کھلا۔ سبحان اللہ، وہ ساری قوم کی ماں تھیں۔

سرسیّد: خدا کرے، ساری قوم کو ایسی مائیں ملیں۔ اب میں کیا بتاؤں کہ کار خیر کو انہوں نے کس طرح

منظم کیا تھا۔ لوگ آج میری خوش انتظامی کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن والدہ نے جس طرح کارخیر کو منظم کیا تھا اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔

غریبوں سے حسن سلوک کا طریقہ

حالی: آپ کے ذہن میں کوئی خاص واقعہ ہے؟

سرسیّد: واقعہ تو نہیں ہے، میں ان کے طریق کارخیر کی تھوڑی سے وضاحت کرنا چاہوں گا۔

حالی: ارشاد!

سرسیّد: ان کا دستور تھا کہ گھر میں جو کچھ آتا گاؤں کا یا ملک کا غلہ، مکانوں کا کرایہ، قلعہ کی تنخواہ، باغوں کا میوہ، سب میں سے بحساب پانچ فیصدی کے، خدا کے نام پر علیحدہ کر دیتی تھیں۔ اپنی بہنوں اور بھانجیوں سے بہ تاکید کہتیں کہ اس طرح پانچ فیصد کے حساب سے راہ خدا میں دیا کریں۔ اس پانچ فیصد کے حساب سے ان کے پاس جو کچھ جنس، غلہ یا پیسہ جمع ہوتا وہ اس کو بہت احتیاط اور منصوبہ بندی سے خیرات کے کاموں میں صرف کرتی رہتی تھیں۔ خیرات میں منصوبہ بندی کرتے میں نے انہی کو دیکھا۔ وہ جس کو جو دیتیں بڑی بہن بن کر بڑی اپنائیت سے دیتی تھیں کہ کسی کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ وہ غریب پردہ نشین عورتوں کی جو معاش سے تنگ ہوتیں، امداد کرتیں۔ غریب لڑکیوں کو بیٹی بنا کر ان کیلئے ضروری جہیز کا بندوبست کرنے کا ایک مستقل سلسلہ تھا۔ معاشرتی اصلاح کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔

حالی: وہ کیسے؟

سرسیّد: بہت سے نوکری پیشہ یا غریب خاندانوں کی لڑکیاں جو کم عمری میں بیوہ ہو جاتیں، انکے نکاح ثانی کو عموماً لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اکثر جوان بیوائیں تمام عمر گھروں میں بیٹھی رہتی تھیں۔ والدہ نے اس رویے کو تبدیل کرنے کی بہت کوشش کی۔ کہا کرتی تھیں کہ نکاح ثانی کو معیوب سمجھنا اور نکاح ثانی اپنی خوشی سے نہ کرنے میں فرق ہے۔ کوئی کسی وجہ سے خود نکاح ثانی نہ کرے، یہ اس کی مرضی ہے۔ لیکن کسی کو نکاح ثانی سے باز رکھنا اور اس کو حقیر و ذلیل سمجھنا بڑا ظلم بلکہ گناہ ہے۔

غریب رشتہ داروں سے سلوک

سرسیّد: یہ حال تو غیروں سے حسن سلوک کا تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے تو اس بھی بڑھ کر کام آتیں۔ غریب رشتہ داروں کے گھر مختلف اشیاء بھجوانے کا ایک دستور بنا رکھا تھا، براہ راست کچھ نہیں تو کسی حیلے بہانے سے۔ تاکہ انہیں لیتے ہوئے کچھ جھجک نہ ہو۔ بعض رشتہ داروں نے کنبے سے باہر شادیاں کر لی تھیں۔ ان سے رشتہ دار ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کی اولاد کو بھی

نظر انداز کرتے تھے۔ والدہ کہا کرتیں، خدا کے حکم سے صلہ رحمی سب پر فرض ہے اور ہر چیز پر مقدم ہے۔ وہ خود ایسے رشتہ داروں کے گھر پابندی سے جاتیں۔ اوران کی اولاد کے ساتھ کھلے دل کے ساتھ شفقت سے پیش آتیں۔

خدا پہ کامل بھروسہ

سرسیّد: والدہ کو خدا پر ایمان عین الیقین کی حد تک تھا۔ کہا کرتی تھیں کہ بیماری میں علاج کروانا، دوا لینا صرف ایک حیلہ ہے۔ شفاء دینے والا خدا ہے۔

ایک قابل قدر نصیحت

سرسیّد: جب میں دلی میں منصف تھا تو میری والدہ مجھے مختلف نوعیت کی نصیحتیں کرتی رہتی تھیں۔ ایک دن بہت تاکید سے کہا، جہاں جہاں تمہیں جانا ضروری ہو وہاں کبھی سواری پر کبھی پیدل جایا کرو۔ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ انسان کو کسی آسائش کا عادی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس میں کمی آ جائے تو برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ میں جامع مسجد اور حضرت شاہ غلام علی درگاہ دونوں جگہ کبھی سواری پر جاتا اور کبھی پیدل۔ کیا بتاؤں زندگی کے سفر میں ہر قدم پر انہوں نے میری کتنی رہنمائی کی۔

(سیرت فریدیہ)

وضع داری کی تاکید

سرسیّد: ابھی میں نے کہا۔ والدہ زندگی کے سفر میں ہر قدم پر میری رہنمائی کرتی تھیں۔
یہ واقعہ بہت پرانا ہے لیکن اس سے ان کی سوچ پر روشنی پڑتی ہے۔ میرے بڑے بھائی سیّد محمد خان اور حکیم غلام نجف خان کی آپس میں گہری دوستی تھی، اس حد تک کہ ایک دوسرے کو بھائی کہتے تھے اور ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ میں بھی ان کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتا تھا۔ سیّد محمد خان کے انتقال کے بعد جب میں فتح پور سیکری سے منصف ہو کر دلی آیا تو حسب سابق حکیم صاحب سے ملتا تھا۔ ہفتہ میں میں دوبار ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ وہ بھی شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور مقررہ اوقات میں ہمارے ہاں تشریف لاتے تھے۔ پھر کسی وجہ سے وہ ناراض ہو گئے اور ہمارے ہاں آنا بہت کم کر دیا۔ لیکن میں بدستور ان کے ہاں جاتا رہا۔ بالآخر انہوں نے ہمارے ہاں آنا بالکل ترک کر دیا۔ لیکن میں پھر بھی اپنی وضع پر قائم رہا، گو جانا کم کر دیا۔ والدہ کو جب صورتحال کا علم ہوا تو ایک دن بلا کر مجھ سے باز پرس کی کہ کیا بات ہے، اب تم حکیم صاحب کے گھر بہت کم جاتے ہو۔

میں نے جو بات تھی، کہہ دی۔ فرمایا، ''احمد بہت افسوس کی بات ہے جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے اب تم خود وہی کر رہے ہو۔ وضع داری کا تقاضا ہے کہ تم دوستی نبھاؤ۔ تم دوسرے کے فرض ادا کرنے یا نہ کرنے کے ذمہ دار نہیں۔ تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ تمھارا فرض کیا ہے۔ تمھیں اس سے کیا کہ دوسرا اپنا فرض ادا کر رہا ہے یا نہیں۔''

(مقالات سرسیّد، جلد شانزدہم، صفحہ ۶۸۹)

صبر کی ایک حیرت انگیز صورت

سرسیّد: والدہ میں صبر و استقامت کا ایسا مادہ تھا جس کی عام حالت میں نظیر نہیں ملتی۔ فطری طور پر انہیں اپنے بڑے بیٹے سیّد محمد خان سے بڑی محبت تھی۔ انہوں نے عالم جوانی میں سینتیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ سوا ماہ صاحب فراش رہے۔ اس عرصے میں سب گھر والے ان کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ والدہ تو دن رات ان کی چارپائی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں۔ انہوں نے چپ سادھ لی تھی۔ غم واندوہ کی تصویر بنی ہر وقت ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھیں۔ دعا، دوا کچھ کام نہ آئی۔ بالآخر ایک دن فجر کے وقت انہوں نے انتقال کیا۔ والدہ پر جو بیتی ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مجھے بڑی تشویش تھی کہ وہ اس جانکاہ حادثے کو کیسے برداشت کر سکیں گی۔ بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے۔ لیکن اسی حالت میں وہ یہ کہہ کر ان کی پائنتی سے اٹھیں کہ جو میرے رب کی مرضی۔ اور وضو کر کے نماز کیلئے کھڑی ہو گئیں۔

حالی: اللہ اکبر!

سرسیّد: اور اشراق تک مصلے پر سے نہیں اٹھیں۔

اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ اتفاق سے انہی دنوں ایک قریبی رشتے دار کی بیٹی کی شادی ہونی قرار پائی تھی۔ شادی کی تاریخ میں صرف چار دن باقی تھے اور لڑکی والوں نے سارے انتظامات کر لئے تھے۔ حسب دستور رشتہ داروں نے بھائی سیّد محمد کے انتقال کی وجہ سے شادی ملتوی کرنا چاہی، جب والدہ کو خبر ہوئی تو بھائی کے انتقال کے تیسرے دن ڈولی منگوا کر ان رشتے داروں کے گھر گئیں اور کہا، میں تمہاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں۔ تین دن سے زیادہ ماتم کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شادی ملتوی کرنے سے تمھارا خاصا نقصان ہو گا۔ جو خدا کو منظور تھا، ہو چکا۔ تم ہرگز شادی ملتوی نہ کرو۔ تمھارے گھر خود چل کر آئی ہوں اور شادی کی اجازت دیتی ہوں تو اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

حالی: اللہ اکبر! کیا خاتون تھیں۔

سرسیّد: میری زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی یہ ہے کہ مجھے والدہ کا سایہ عاطفت میسر رہا اور وہ تربیت جس نے مجھے سیّد احمد بنایا۔ ان کی عالی خیالی اور فرشتہ خصلتی ہمیشہ میرے لئے مثال رہی۔

حالی: انکا کوئی اور امتیازی وصف؟

سرسیّد: ان کا ظرف بہت بڑا تھا۔

درگزر کرنے کی نصیحت

سرسیّد: ان کی درگزر کرنے کی عادت کا ایک بار پھر میں ذکر کروں گا۔ وہ مجھے اکثر نصیحت کرتی تھیں کہ اگر کسی نے تمھارے ساتھ ایک دفعہ نیکی کی اور پھر ایک دفعہ برائی کی یا دو دفعہ نیکی کر کے دو دفعہ برائی کی تو یہ نہ سمجھو کہ برابر ہوگئی۔ یاد رکھو کوئی نیکی ایک بار کرے، اس کے بعد وہ خواہ کتنی بار برائی کرے، اس پہلی نیکی کے احسان کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ زندگی کی بنیادی حقیقت نیکی ہے، بدی نہیں۔

(سیرت فریدیہ)
(بحوالہ مقالات سرسیّد، جلد شازدہم، صفحہ ۱۹۱)

آخری وصیت

سرسیّد: آخر میں، میں والدہ کی آخری وصیت کا ذکر کروں گا۔

حالی: کوئی خاص وصیت تھی؟

سرسیّد: جی ہاں، انکی وصیت بھی ان کی شخصیت کی آئینہ داری تھی۔ والدہ نے انتقال سے ایک روز پہلے صرف دو وصیتیں کیں۔ ایک یہ کہ انہیں بغلی قبر میں دفن کیا جائے جو مسنون ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ میرے ذمے نہ تو کوئی روزہ قضا ہے نہ نماز۔ گو ان آخری دنوں میں بھی میں نے جیسے ہو سکا نمازیں پڑھی ہیں۔ تاہم اگر میں زندہ رہتی تو ان کی بھی قضا پڑھتی۔ اس واسطے میرے مرنے کے بعد ان دنوں کی قضا نمازوں کا حساب کر کے ان کے کفارے کے گیہوں غریبوں میں بانٹ دینا۔ دوسرے دن انہوں نے قضا کی۔ اور میں نے ان کی دونوں وصیتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

(سیرت فریدیہ)
(بحوالہ مقالات سرسیّد، جلد شازدہم، صفحہ ۶۹۵)

لڑکپن کے دن

جو چاہو کھیلو، کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو

حالی: آپ کا لڑکپن کیسا گزرا؟ کتنی آزادی تھی؟ کھیلتے کودتے، کیسے گزرا؟

سرسیّد: بچپن میں مجھ پر نہ تو ایسی قید تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل پابندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جس کے ساتھ چاہیں، کھیلتے کودتے پھریں۔ میری خوش نصیبی یہ تھی کہ میرے ماموں، خالہ اور دیگر نزدیکی رشتہ داری کے چودہ پندرہ لڑکے میرے ہم عمر تھے جو آپس میں کھیلنے کودنے کیلئے کافی تھے۔ اس لئے مجھے نوکروں، اجلافوں کے بچوں اور اشرافوں کے آوارہ لڑکوں سے ملنے جلنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ میرے بزرگوں نے یہ اجازت دے رکھی تھی کہ جس کھیل کو تمھارا جی چاہے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ اس لیے ہم لڑکے جو کچھ کھیلتے تھے، اپنے بڑوں کے سامنے کھیلتے تھے۔ خواجہ فرید کی حویلی میں جس میں مَیں اور میرے ہم عمر لڑکے رہتے تھے، اس کا چوک اور اس کی چھتیں ہر قسم کی بھاگ دوڑ کے کھیلوں کیلئے کافی تھیں۔ ابتدا میں اکثر گیند بلا، کبڈی، کیڑیاں، آنکھ مچولی، چیل چلو کھیلتا تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں کیڑیاں کو اشراف معیوب جانتے تھے مگر میرے بزرگوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ تم آپس میں سب بھائی کیڑیاں بھی کھیلو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

حالی: کھیل میں جھگڑا بھی ہوتا ہے۔ اس وقت کیا ہوتا تھا؟

سرسیّد: کھیل میں جب کچھ جھگڑا ہو جاتا تو بڑوں میں سے کوئی آ کر تصفیہ کروا دیتا۔ اور جس کی طرف سے چنید (بے ایمانی) ہوتی اسے برا بھلا کہتا اور شرمندہ کرتا کہ چنید کرنا بے ایمانی کی بات ہے۔ سب بڑوں کی تاکید تھی کہ کبھی چنید مت کرو۔ اور جو چنید کرے اس کو ہرگز اپنے ساتھ مت کھیلنے دو۔

حالی: کیا بچپن میں آپ کو آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت تھی؟

سرسیّد: باوجود اس قدر کھیلنے کی آزادی کے، بچپن میں مجھے تنہا باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب والدہ نے اپنے رہنے کی جدا حویلی بنوائی اور وہاں آ کر رہیں تو باوجودیکہ اس حویلی میں اور نانا صاحب کی حویلی میں صرف ایک سڑک درمیان تھی، جب کبھی میں ان کی حویلی میں جاتا

تو ایک آدمی میرے ساتھ جاتا۔ اس لیے بچپن میں مجھے گھر سے باہر جانے اور عام صحبتوں میں بیٹھنے یا آوارہ پھرنے کا بالکل اتفاق نہیں ہوا۔

حالی: کبھی کھیل میں لڑائی بھڑائی ہوئی؟

سرسیّد: میں بچپن میں بہت مستعد، شوخ اور شرارتی تھا۔ ایک بار میں شطرنج کھیلتے ہوئے اپنے رشتہ دار بھائی سے لڑ پڑا۔ میرے مکے سے اس کے ہاتھ کی انگلی اتر گئی۔ اور کئی دن کے بعد ٹھیک ہوئی۔ ہمیشہ یوں ہی لڑائی بھڑائی مار کٹائی ہوتی تھی۔ مگر آخر کو ایک ہو جاتے تھے۔

(حیات جاوید۔ حالی۔ صفحہ ۴۹)

طریقِ تربیت

حالی: سیّد صاحب۔ بچپن میں آپ تربیت کے کس سانچے سے گزرے۔ آپ کے گھر کے کھانے پینے کے آداب اور طریقے کیا تھے؟

سرسیّد: میرے نانا (خواجہ فریدالدین جو علم و فضل میں یکتا اور ریاضیات میں وحید عصر تھے) صبح کا کھانا اندر زنانہ میں کھاتے تھے۔ ایک چوڑا چکلا دسترخوان بچھتا تھا۔ بیٹے بیٹیاں پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں اور بیٹوں کی بیویاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ بچوں کے آگے خالی رکابیاں ہوتی تھیں۔ نانا صاحب ہر ایک سے پوچھتے تھے کہ کون سی چیز کھاؤ گے؟ جو کچھ وہ بتاتا وہی چیز چمچے میں لے کر اپنے ہاتھ سے اس کی رکابی میں ڈال دیتے۔ تمام بچے بہت ادب اور صفائی سے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ سب کو خیال رہتا تھا کہ کوئی چیز گرنے نہ پائے۔ ہاتھ کھانے میں زیادہ نہ بھرے۔ اور نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نہ نکلے۔ رات کا کھانا وہ باہر دیوان خانہ میں کھاتے تھے۔ زنانہ ہو جاتا تھا۔ میری والدہ اور میری چھوٹی خالہ کھانا کھلانے آتی تھیں۔ ہم سب لڑکے ان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ہم کو بڑی مشکل پڑتی تھی۔ کسی کے پاؤں کا دھبا سفید چاندنی پر لگ جاتا تھا تو نہایت ناراض ہوتے تھے۔ روشنائی وغیرہ کا دھبا کسی کے کپڑے پر ہوتا تو اس سے بھی ناخوش ہوتے تھے۔ شام کو چراغ جلنے کے بعد ان کے پوتے اور نواسے جو مکتب میں پڑھتے تھے، اور جن میں سے ایک میں بھی تھا، ان کو سبق سنانے جاتے تھے۔ جس کو سبق اچھا یاد ہوتا اس کو کسی قسم کی عمدہ مٹھائی ملتی۔ اور جس کو یاد نہ ہوتا اس کو کچھ نہ دیتے۔ بلکہ جھڑک دیتے۔

(حیات جاوید۔ حالی۔ صفحہ ۴۹)

تیراکی اور تیراندازی میں مہارت

حالی: سیّد صاحب ایک بار آپ نے تیراکی اور تیراندازی کے مقابلوں کا بھی ذکر کیا تھا۔

سرسیّد: ہاں میں نے اور بڑے بھائی (سیّد محمد خان) نے اپنے والد سے تیرنا سیکھا تھا۔ ایک زمانہ تو وہ تھا کہ ایک ۸طرف دلی کے مشہور تیراک مولوی علیم اللہ کا غول ہوتا تھا جن میں مرزا مغل اور مرزا تُغل بہت سر برآوردہ اور نامی تھے۔ اور دوسری طرف ہمارے والد کے ساتھ سو سو شاگردوں کا گروہ ہوتا تھا۔ یہ سب ایک ساتھ دریا میں کودتے تھے۔ اور مجنوں کے ٹیلے سے شیخ محمد کی بائیں تک یہ سارا گروہ تیرتا جاتا تھا۔ پھر جب ہم دونوں بھائی تیرنا سیکھتے تھے اس زمانے میں بھی تیس چالیس آدمی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ انھی دنوں میں نواب اکبر خان اور چند رئیس زادے بھی تیرنا سیکھتے تھے۔ زینۃ المساجد کے پاس نواب احمد بخش خان کے باغ کے نیچے نہر بہتی تھی۔ وہاں سے تیرنا شروع ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت سب تیراک زینۃ المساجد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور مغرب کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے اپنے گھر چلے آتے تھے۔ میں ان جلسوں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔

تیراندازی کی صحبتیں بھی میرے ماموں نواب زین العابدین کے مکان پر ہوتی تھیں۔ مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی، یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا، وہ بخوبی یاد ہے۔ اس زمانے میں دریا کا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد جب تیراندازی ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خان، نواب سیّد عظمت اللہ خان، نواب ابراہیم علی خان اور چند شاہزادے اور رئیس اور شوقین اس جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خان رئیس فیروز پور جھرکہ جب دلی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اس زمانے میں تیراندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا بیٹھا تو والد صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا، مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے۔ یہ جلسہ برسوں تک رہا۔ پھر موقوف ہو گیا۔

اہل اللہ سے عقیدت

حالی: سیّد صاحب! آپ کے والد گرامی میر متقی شاہ غلام علی کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ ان سے آپ کا کوئی تعلق تھا؟

سرسیّد: اہل اللہ اور برگزیدہ بزرگوں کی عظمت کا خیال بچپن سے میرے دل میں بٹھا دیا گیا تھا۔ میں اپنے والد کے ساتھ اکثر شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ اور شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا رنگ اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔

(حیات جاوید۔ حالی۔ صفحہ ۳۲)

عہد شباب

انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ارادے سے خود کو تبدیل کر سکتا ہے اور کر لیتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو بلکہ پوری قوم کو متاثر کر سکتا ہے۔ تاریخ کا دھارا موڑ سکتا ہے اور موڑ لیتا ہے۔ سر سیّد احمد خان ایسے ہی غیر معمولی انسان تھے۔ زندگی کا سفر اپنے عہد کے رؤسا کے نوجوانوں کی طرح اس زمانے کے مقبول لہو ولعب کے مشاغل سے شروع کیا (جو اس دور انحطاط میں اشراف میں عام تھے)۔

حالی: قبلہ گاہی، اب جو آپ بس سو ہیں، آپ کا عنفوان شباب کیسا گزرا؟

سر سیّد: میرا عنفوان شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔ میں راگ رنگ کی محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے ساتھ جاتا تھا۔ اور وہاں راگ رنگ اور دعوتوں جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ ہولی کے جلسوں میں جاتا تھا۔ پھل والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتا تھا۔ اور وہاں کی صحبتوں میں شریک ہوتا تھا۔ دلی میں بسنت کے میلے میں جو موسم بہار کے آغاز میں درگاہوں پر ہوتے تھے، جاتا تھا۔ خود میرے نانا خواجہ فرید کی قبر چونسٹھ کھمبے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا، اس میں میں اپنے بھائیوں کے ساتھ منتظم و مہتمم ہوتا تھا۔

اس زمانے میں خواجہ محمد اشرف ایک بزرگ دلی میں تھے۔ انکے گھر بسنت کا جلسہ ہوتا تھا۔ شہر کے خواص وہاں مدعو ہوتے تھے۔ نامی گرامی طوائفیں زرد لباس پہن کر وہاں آتی تھیں۔ مکان میں بھی زرد فرش ہوتا تھا۔ دالان کے سامنے ایک چبوترہ تھا جس میں حوض تھا۔ اس حوض میں زرد پانی کے فوارے چھوٹتے تھے۔ صحن میں جو چمن تھا اس میں جھڑان زرد پھول کھلے ہوتے تھے۔ اور گلوکارائیں باری باری نغمہ سرا ہوتی تھیں۔ میں ہمیشہ وہاں جاتا تھا اور اس جلسے میں شریک ہوتا تھا۔

خود میرے ماموں نواب زین العابدین خان کے مکان کے بڑے بڑے نامی گویے دھرپت اور خیال گانیوالے جمع ہوتے تھے۔ میر ناصر احمد جو دلی میں مشہور بین بجانے والے تھے، وہ آتے تھے۔ گانا ہوتا تھا اور بین بجتی تھی۔ اس طرح خواجہ میر درد کے سجادہ نشین ہر مہینے کی چوبیسویں رات کے وقت ایک درویشانہ جلسہ کیا کرتے تھے۔ اس میں بڑے نامی گرامی گویے آتے تھے۔ دھرپت اور خیال گاتے تھے۔ اور میر ناصر جو اسی خاندان میں بیعت

تھے، بین بجانے میں کمال دکھاتے تھے۔ان سب جلسوں میں میں اکثر شریک ہوتا تھا۔
ایک اور جلسہ رائے پران کشن کے مکان پر ہوتا تھا جو ایک معزز رئیس اور نہایت وضع دار تھے۔ جنا نامی ایک مغنیہ نہایت خوش آواز دھرپت اور خیال گانے اور بین بجانے میں مشہور تھی۔ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر رائے پران کشن کے گھر میں پڑ گئی تھی۔اس کی خاطر سے وہ ہر مہینے کی سترہویں کو ایک جلسہ کیا کرتے تھے۔شہر کے رئیس جن سے ان کی دوستی تھی، بلائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے گویے، بہادر خان ستارن اور میر ناصر احمد جمع ہوتے تھے۔ میرے ماموں نواب زین العابدین خان ہمیشہ اس جلسے میں جاتے تھے۔ میں بھی بارہا انکے ہمراہ گیا ہوں۔
جب میں آگرہ میں تعینات تھا یہ وہ زمانہ تھا جب صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی۔ اور وہاں منشی امیر علی خان، مولوی غلام احمد جیلانی، مولوی محمد شفیع اور بہت سے اشراف خاندانوں کے نامی وکیلوں اور عہدے داروں کا مجمع تھا۔ یہ سب لوگ نہایت زندہ دل مرنج و مرنجان اور زندگی بے فکری و فارغ البالی کے ساتھ ہنسی اور خوشی میں گزارتے والے تھے۔ تاج گنج، اعتماد الدولہ اور نور افشاں میں وہ آئے دن عیش و نشاط کے جلسے کیا کرتے تھے۔ میں نے بھی ان جلسوں کی کیفیات دیکھی تھیں اور ان میں شریک ہوتا تھا۔
اب تو دل و دماغ کی کیفیت ہی بلکہ جنون ہی کچھ اور ہے۔اس زمانے میں طبیعت میں شوخی تھی، بذلہ سنجی تھی۔

حالی: وہ تو اب بھی کم نہیں۔

سرسیّد: لیکن اس زمانے میں جب آتش جوان تھا، اور بات تھی۔طبیعت مائل بہ ظرافت زیادہ تھی۔ بات بات پہ فقرہ ہو جاتا تھا۔

حالی: مثلاً؟

سرسیّد: اس زمانہ میں دلی میں ایک مشہور مغنیہ شیریں جان نامی نہایت حسین تھی۔ مگر اس کی ماں بھدی اور سانولے رنگ کی تھی۔ ایک مجلس میں شیریں جان اپنی ماں کے ساتھ مجرے کیلئے آئی تھی۔ میرے قریب ہی میرے قندھاری دوست بیٹھے تھے۔ وہ اس کی ماں کو دیکھ کر بولے ''مادرش بسیار تلخ است'' (اس کی ماں بہت تلخ ہے) میں نے برجستہ کہا۔ ''اگر چہ تلخ است ولیکن بر شیریں دارد۔ اگر چہ تلخ ہے لیکن اس کا پھل میٹھا ہے)

حالی: بہت خوب۔ بڑا برمحل مصرعہ ہے۔ لیکن قبلہ سوال یہ ہے کہ پھر آپ نے ان مقبول عام سرگرمیوں کی دلدل سے اپنے آپ کو کیسے نکالا؟

سرسیّد: ماحول کا اثر انسان پر ضرور ہوتا ہے۔ اور جتنی ناسمجھی ہو اتنا زیادہ۔ اس زمانے میں بھی میں سوچتا تو رہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ پھر یکا یک ایک تبدیلی آئی۔ دل یک دم ان مشغلوں سے

اچاٹ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے لے لیتا ہے۔

حالی: پھر بھی کوئی خاص سبب تو ہو گا۔

سرسیّد: منجملہ دیگر اسباب کے جو اس تبدیلی حالت کا باعث ہوئے، سب سے بڑا سبب میرے بڑے بھائی کا قبل از وقت انتقال کرنا تھا۔ ہم دونوں بھائیوں میں محبت اور اتحاد اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ شہر میں اس کی نظیر دی جاتی تھی۔ میرے بھائی کا قول تھا ''کیسی ہی عیش ونشاط کی مجلس ہو اگر سیّد احمد وہاں نہ ہو تو مجھ کو وہ مجلس جہنم معلوم ہوتی ہے۔'' ایسا ہی حال میرا اپنے بھائی کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بھائی کے مرتے ہی میرا دل رنگین صحبتوں سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ لباس میں جو اس وقت بانکپن سمجھا جاتا تھا، یک قلم ترک کر دیا۔ سر گھٹوالیا، داڑھی چھوڑ دی، پائنچے متشرع کر لئے، کرتا پہن لیا۔ رنگین طبع نوجوانوں کی صحبت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اور روز بروز مولویت کا رنگ چڑھنے لگا کہ اس وقت قوم میں یہی اعلیٰ درجہ انسانی ترقی کا سمجھا جاتا تھا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو اصلی ترقی تک پہنچنے کیلئے اس مرحلے کا طے کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ:

حور و جنت جلوہ بر زاہد کند در راہ دوست
اندک اندر عشق در کار آورد بیگانہ را

حالی کی ''حیات جاوید'' میں سے یہ اقوال لکھنے کے بعد ہم ''سرسیّد کی تہذیب الاخلاق'' کے زمانے کی ایک تحریر کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

''ہم بھی اس رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ کیا کیا خیالات ہماری قوم کے ہیں جو ہم میں نہ تھے۔ اور کونسی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھا رہی ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر تھے۔ جب زاہد خشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جب صوفی تھے تو رومی سے برتر تھے۔ اب خاکسار ہیں اور اپنی قوم کے غمخوار۔''

باب دوم

آغازِ سفر

(گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان)

کارزارحیات میں پہلا پُرعزم قدم

عدلیہ میں سرکاری ملازمت

ایک تاریخ ساز فیصلہ

ایک بااصول پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا

سرکاری ملازمت کا آغاز

حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''جس زمانے (۱۸۳۷ء) میں سرسیّد نے اپنی دور اندیشی اور فراست سے انگریزی نوکری اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اس زمانے میں دلی اور اس کے نواح کے مسلمان عموماً انگریزی نوکری اور انگریزی تعلیم سے متنفر تھے۔ خصوصاً جو خاندان قلعہ دہلی سے کچھ تعلق رکھتے تھے ان کو انگریزی نوکری کا خواب بھی نہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ سرسیّد نے جب سرکاری ملازمت کی خواہش ظاہر کی تو ان کے تمام عزیز رشتے داروں نے اس ارادے کی مخالفت کی۔ مگر چونکہ ان کے نانا خواجہ فرید الدین احمد نے بعض اہم سرکاری خدمات انجام دی تھیں اور ان کے خالو خلیل اللہ خان اس وقت ایک عدالتی منصب پر مامور رہتے۔ اور ان دو حوالوں سے بدلتے ہوئے حالات کا کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا۔ قلعہ معلّٰی کی صورت حال تو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے قلعہ کے تبرک پہ قناعت نہ کی۔ اور انگریز کی نوکری کا تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ یہ تاریخ ساز فیصلہ ان کی اپنی دور اندیشی اور فراست کا ثمرِ دور رس تھا۔''

ایک تقدیر ساز رویہ

مختلف شعبوں میں سرسیّد کی غیر معمولی کامیابی کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھی۔ شروع دن سے اس اصول پر کاربند رہے کہ جو کام کرنے ہے اس کو جاننا ہے اور پھر اسے پوری دیانت اور مکمل جانفشانی سے کرنا ہے، بہتر سے بہتر کرنا ہے۔ وہ ایک لحاظ سے کمال پسند (Perfectionist) تھے۔ اس ضمن میں حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد نے ابتدائے ملازمت ہی سے یہ نکتہ ذہن نشین کر لیا تھا کہ کسی کام کے لئے اس کام کی لیاقت اور اس کے فرائض کی اطلاع حاصل کرنی ضروری ہے۔''

ملازمت کی پیشکش اور سرسیّد کا انکار

۱۸۳۸ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد سرسیّد نے جب سرکاری ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا تو اپنے خالو خلیل اللہ کی عدالت میں کام سیکھنا شروع کر دیا۔ ابھی انہیں کام سیکھے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن نے، جو سرسیّد کو تھوڑا بہت جانتے تھے، انہیں بلا بھیجا۔

ہملٹن: آپ محکمہ قانون میں آنا چاہتے ہیں؟

سرسیّد: ارادہ تو ہے۔

ہملٹن: سرکار آپ کو عدالت سیشن کا سررشتہ دار مقرر کرنا چاہتی ہے۔

سرسیّد: شکریہ، لیکن میں یہ منصب قبول کرنے سے معذرت چاہوں گا۔

ہملٹن: کیوں؟

سرسیّد: جس کام کی فی الحال میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا، اس کو کیوں کر قبول کر سکتا اور اس کے فرائض ادا کر سکتا ہوں؟

''حیات جاوید'' میں حالی یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں

''جب وہ آگرہ کی کمشنری میں نائب منشی کے بالکل ابتدائی عہدے پر مقرر ہوئے تو انہوں نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ نہ صرف یہ بلکہ ترتیبِ دفتر کا ایک اصول بنایا جس کے مطابق تمام دفتر کمشنری آگرہ کا مرتب کیا گیا۔ پھر عدالت منصفی کے متعلق قوانین کا ایک خلاصہ تیار کیا۔ جس کو صاحب کمشنر آگرہ نے گورنمنٹ میں پیش کر کے ان کے عہدے منصبی کی سفارش کی۔''

معاشی تنگی کا دور اور آثار الصنادید کی تصنیف

تنخواہ میں سے پانچ روپے

سرسیّد نے اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز دِلی کی تاریخی عمارات پر تحقیق سے کیا تھا۔

حالی: قبلہ، آثار الصنادید لکھنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

سرسیّد: جب میں ۱۸۴۶ء میں دلی میں منصف تھا تو مجھے دلی اور نواح شہر کی قدیم عمارات پر تحقیق کرنے کا خیال آیا۔ تحقیق کے علاوہ اس کی ایک وجہ معاشی تھی۔

حالی: وہ کیسے؟

سرسیّد: والد کے انتقال کے بعد قلعہ کی تنخواہیں تقریباً کل کی کل بند ہو گئی تھیں۔ بڑے بھائی کے مرنے کے بعد سو روپے کی آمدنی ختم ہو گئی تھی۔ گھر کا گزارہ میری سو روپے کی ماہانہ تنخواہ پر تھا۔
میں کل تنخواہ والدہ کو دے دیتا تھا اور وہ اس میں سے صرف پانچ روپے مہینہ اوپر کے خرچ کے لئے مجھے دیتی تھیں۔ باقی میرے تمام اخراجات انکے ذمے تھے۔ جو کپڑا وہ بنا دیتی تھیں، میں پہن لیتا تھا اور جیسا کھانا وہ کھلا دیتی تھیں، کھا لیتا تھا۔
خرچ کی تنگی کو کم کرنے کیلیئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے اخبار سیّد الاخبار کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اور عمارات کے حالات ایک کتاب کی شکل میں مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ دلی کی قدیم عمارتوں پر تحقیق بڑا دقت طلب اور صبر آزما کام تھا۔

حالی: آپ کا طریق کار کیا تھا؟

سرسیّد: ہفتہ وار تعطیل کے دن میں عمارات بیرون شہر کی تحقیق کے لئے باہر جاتا تھا۔ جب کئی دن کی تعطیل ہوتی تھی تو اکثر رات کو بھی باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس کام میں میرے دوست اور ہمدم مولانا امام بخش صہبائی اکثر میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ان عمارتوں پر کام کرنا مزید مشکل اس لئے ہو گیا تھا کہ باہر بیسیوں عمارتیں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے۔ اور جو متفرق و پراگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ

عمارتیں کیوں بنائی گئی تھیں۔ اور اس سے کیا مقصود تھا۔ کتبوں میں جن بانیوں کے نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لئے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ بعض علمی عمارتوں کی حالت ایسی متغیر ہوگئی تھی کہ ان کی ماہیت معلوم ہونی مشکل تھی۔ پھر اکثر عمارتوں کے عرض و طول وارتفاع کی پیمائش کرنی، ہر ایک عمارت کی صورت حال قلمبند کرنی، کتبوں کے چربے اتارنے اور ہر ایک کتبے کے بعینہٖ اس کے اصلی خط کو دکھانا، ہر ٹوٹی پھوٹی عمارت کا نقشہ جوں کا توں مصور سے کھنچوانا، اور اس طرح کچھ اوپر سو سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برآ ہونا فی الحقیقت نہایت دشوار کام تھا۔ قطب صاحب کی لاٹھ کے بعض کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے تھے ان کے پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے متوازی بندھوالیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر کتبے کا چربہ اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔

حالی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسیّدؒ نے شروع میں چند اختلافی نوعیت کے مذہبی موضوعات پر اس دور کے مخصوص محدود نقطہ نظر سے لکھنا شروع کیا تھا۔ آثار الصنادید جیسے معروضی اور تحقیقی موضوع پر قلم اٹھانا ان کے ذہن کی ایسی جست تھی جس نے انہیں جدید دور کا انسان بنا دیا۔ یہ اس امر کا اشارہ بھی تھا کہ ان میں تخلیقی کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت اور ہمت ہے۔''

''حیات جاوید'' میں حالی لکھتے ہیں:

''سرسیّد کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور ان کی یہ حالت بالکل ابوتمام کے اس شعر کے مصداق تھی

ویصعد حتی یظن الوریٰ
بان لہ حاجة فی السماء

یعنی وہ ایسے شوق سے اوپر چڑھ رہا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو آسمان سے کچھ کام ہے۔''

کردار -Integrity- کا پہلا بڑا امتحان

سرسیّد نے تحقیقی دماغ پایا تھا۔ بقول حالی دشوار کاموں میں ان کا جی بہت لگتا تھا۔ دہلی کی منصفی کے زمانے میں انہیں آئین اکبری پر کام کرنے کی پیش کش ہوئی، معاوضہ بھی معقول تھا اور اس زمانے میں انہیں پیسے کی ضرورت بھی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

حالی: قبلہ! آپ نے آئین اکبری کی تصحیح کا کام دلی میں نہیں کیا۔ بجنور پہنچ کر شروع کیا۔ آخر کیوں؟

سر سیّد: پوری بات یوں ہے کہ جب میں دلی میں منصفی کے عہدے پر فائز تھا تو حاجی قطب الدین نے جو دلی کے ایک مشہور تاجر تھے مجھ سے درخواست کی کہ اگر میں آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح کر دوں تو وہ اسے چھپوا دیں گے۔ وہ اس کے معاوضے میں آئین اکبری کے سولہ سو روپے کی قیمت کے چھپے ہوئے نسخے میری نذر کریں گے۔ یہ پیش کش بہت اچھی تھی۔ مجھے پیسے کی ضرورت بھی تھی۔ یہ کام میرے ذوق کا بھی تھا۔ لیکن میں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

حالی: کیوں؟

سر سیّد: میں نے دلی میں ایک اہم سرکاری منصب پر فائز ہوتے ہوئے وہیں کے ایک تاجر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہ سمجھا۔

(حیات جاوید۔ حالی)

سفارش افسر کی بھی نہیں

قومی رہنما بننے سے بہت پہلے بھی سیّد احمد نے اپنے کام اور اپنی بات کے کھرے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں وہ صدر امین ہو کر رہتک پوسٹ ہوئے۔ وہاں سابق صدر امین مسٹر کرک اور قائم مقام مجسٹریٹ مسٹر گزی میں چپقلش چل رہی تھی۔ مسٹر کرک کے خلاف بے شمار مقدمات بدعنوانی اور رشوت ستانی کے چل رہے تھے۔ مخبروں کی بن آئی۔ رہتک کا نمبر دار بابر خان خاص طور سے مسٹر گزی کے لئے مخبری کرتا تھا۔ اور ان کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔

سیّد احمد خان کو اپنے کام سے کام تھا۔ انصاف کی ترازو لئے بیٹھے تھے۔ اور کانٹے کی تول تولتے جاتے تھے۔ بابر خان نمبردار کو شاید مجسٹریٹ سے اپنے تعلق کا غرہ تھا کہ سیّد کی عدالت میں اس نے جھوٹی گواہی دی۔ انہوں نے اس پر فوراً اس کو ماخوذ کیا۔ بات مجسٹریٹ بہادر مسٹر گزی تک پہنچی۔

مسٹر گزی: آپ نے بابر خان کو ماخوذ کیا ہے۔

سیّد احمد: اس نے کام ہی ایسا کیا تھا۔ جھوٹی گواہی کی دفعہ میں ماخوذ ہے۔

مسٹر گزی: میں جانتا ہوں۔

سیّد احمد: مجھے افسوس ہے کہ قانونی کارروائی کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

حالی، خانہ بہادر غلام نبی خان کے حوالے سے، جو اس وقت وہاں نائب رشتہ دار کلکٹری تھے، لکھتے ہیں:

''لوگ صاحب بہادر مجسٹریٹ تو مجسٹریٹ، ان کے مخبروں سے بھی دبتے تھے۔ مگر سیّد صاحب نے وہاں جا کر کئی کام صاحب مجسٹریٹ کی مرضی کے خلاف کیے اور کبھی دباؤ

نہیں مانا۔ گزی صاحب نے بابر خان کی بڑی سفارش کی لیکن سیّد احمد خاں نے علی الرغم اس کو دورہ سپرد کر دیا۔ جہاں سے اسے تین برس کی قید کا حکم ہوا۔''

(حیات جاوید۔ حالی)

پہلے قانون کے تقاضے پورے کیجئے

۱۸۵۰ء کا واقعہ ہے۔ سیّد احمد رہتک میں صدر امین تھے۔ رہتک کی میونسپل کمیٹی کا کسی ٹھیکیدار سے تنازعہ چل رہا تھا۔ تمام ممبران کمیٹی بشمول مجسٹریٹ مسٹر گزی، اس کی جائیداد بحق سرکار نیلام کرانا چاہتے تھے۔

مسٹر گزی: تمام ممبران متفق ہیں کہ ٹھیکیدار کی جائیداد نیلام کر دی جائے۔

سیّد احمد: مگر میں اس اقدام سے متفق نہیں ہوں۔

مسٹر گزی: کیوں؟

سیّد احمد: اس لئے کہ بائی لاز کے مطابق کمیٹی ایسا کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ پہلے دیوانی ڈگری جاری کرانا ضروری ہے۔

خان بہادر غلام علی خان کے حوالے سے جو اس وقت نائب سررشتہ دار کلکڑی تھے، حالی لکھتے ہیں:

''جب کمیٹی کے سارے ممبران اور مسٹر گزی نے ان کی رائے سے اختلاف کیا تو سیّد احمد خان نے اپنی رائے مدلل تحریر کر کے کمیٹی میں بھیج دی۔ بالآخر گزی صاحب کو ان ہی کی رائے کے مطابق عمل کرنا پڑا۔''

منشی صاحب ہی کا یہ بھی بیان ہے کہ جب سے مسٹر گزی نے مسٹر کرک کو ٹرک دی تھی، صدر امینی کی کچھ وقعت لوگوں کی نظر میں نہیں رہی تھی۔ خصوصاً ملازمان کچہری اس کو محکمۂ محض سمجھنے لگے تھے۔ اتفاق یہ کہ ایک شخص جس کا باپ صاحب ضلع کے محکمہ میں سررشتہ دار تھا، صدر امینی میں بہ زمرہ محرران نوکر تھا۔ اور اس گھمنڈ پر کہ میرا باپ صاحب مجسٹریٹ کی ناک کا بال ہے، اپنا کام نہایت بے پروائی سے کرتا تھا۔ سرسیّد نے اس کو بعلت غفلت و بے پروائی کے معطل کر دیا۔ ہر چند ضلع والوں نے سفارش کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر انہوں نے کچھ التفات نہ کیا۔ یہاں تک کہ وہ دیوانی تعطیل میں دلی چلے گئے۔ مگر تعطیل سے واپس آ کر کسی کے کہنے سے بلکہ اس کے باپ کے بڑھاپے کا خیال کر کے کو پھر بحال کر دیا۔

حالی لکھتے ہیں:

''یہ واقعات اس زمانے کے ہیں جب کہ سرسیّد یورپین حکام کی نظر میں ایک ہندوستانی عہدے دار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اور جو وقعت اور اعتبار ان کو ایام غدر کی

خدمات کے بعد انگلش حکام اور خود انگلش گورنمنٹ میں حاصل ہوا اس کا عشر عشیر بھی اس وقت حاصل نہ تھا۔ مگر اس حالت میں بھی انہوں نے اپنی آن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اپنے فرائض منصبی نہایت آزادی اور دلیری سے ادا کرتے رہے"۔

منشی غلام نبی خان کہتے ہیں کہ:

"منی صاحب جو مسٹر کرک کے مقدمات کی تحقیقات کے لئے جوڈیشل کمشنر ہو کر رہتک گئے تھے جب سرسیّد ان سے ملے تو وہ ان کی ملاقات سے نہایت خوش ہوئے۔ اور ان کی غیبت میں لوگوں سے کہا کہ ہم نے ہندوستانی افسروں میں ایسا صاف اور آزاد طبیعت کوئی افسر نہیں دیکھا۔ اسی وجہ سے سرسیّد کا منی صاحب سے اس قدر ربط بڑھ گیا تھا کہ "آثار الصنادید" کا انگریزی ترجمہ جو مسٹر رابرٹس جنٹ مجسٹریٹ دہلی نے ناتمام چھوڑ دیا، اس کے پورا کرنے کا وعدہ انہوں نے سرسیّد سے کیا۔ چنانچہ جب صاحب موصوف مراد آباد میں جج ہو گئے تو بہت سا ترجمہ انہوں نے کرایا۔"

(حیات جاوید، صفحہ ۲۶، حصہ دوم)

ملازمت خودداری کے ساتھ

سرسیّد نے ۱۸۳۸ء سے ۱۸۷۶ء تک محکمہ قانون میں سرکاری ملازمت کی۔ مختلف پیشوں پر فائز رہے۔ بڑے بڑے خودسر افسروں سے پالا پڑا لیکن نوکری سر اٹھا کر کی کبھی عزت نفس پر حرف نہیں آنے دیا۔

عذر ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے سرسیّد دلی میں منصف تھے اور سیشن جج جان پائن گینس جن کے طنطنہ کا تمام شہر میں طوطی بولتا تھا۔ دلی کی کمشنری کے دو جاگیردار بھائیوں میں جاگیر پر جھگڑا ہوا تھا اور مقدمہ جان پائن کی عدالت میں چل رہا تھا۔ ان میں سے ایک بھائی کے قریبی مراسم سرسیّد سے تھے اور آنا جانا تھا۔ دوسرے بھائی نے جج سے شکایت کی کہ میرے بھائی کو منصف بہکاتا ہے۔ اسے میرے بھائی سے ملنے سے منع کیا جائے۔ جان پائن نے سرسیّد کو بلایا۔

جان پائن: آپ کو معلوم ہے کہ ان بھائیوں کا مقدمہ عدالت میں ہے۔

سیّد احمد: میرے علم میں ہے۔

جان پائن: بڑے بھائی نے شکایت کی ہے کہ آپ دوسرے بھائی سے ملتے ہیں۔ اور اسے مشورے دیتے ہیں۔

سیّد احمد: تو پھر؟

جان پائن: میرا خیال ہے کہ جب تک مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو جائے آپ اپنے دوست سے ملنا جلنا ترک کر دیں۔

سیّد احمد: یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہ مقدمہ میری عدالت میں ہے نہ میرا اس سے کوئی تعلق ہے۔ بے شک

آپ کا ماتحت ہوں۔ سرکاری معاملات میں آپ جو کچھ ہدایات دیں گے اس کی بسر و چشم تعمیل کروں گا۔ مگر میرے ذاتی تعلقات میں آپ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔ اگر آپ کہیں کہ تم چند روز اپنی ماں یا بہن سے ملنا چھوڑ دو تو میں کیوں کر آپ کے حکم کی تعمیل کر سکتا ہوں؟

ایک عظیم الشان عملی زندگی کی ابتدا

اپنی محنت سے
اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی پہلی کوشش

حالی: قبلہ سیّد صاحب آپ کے والد گرامی میر متقی تو قلعہ کے متوسلین میں سے تھے۔ آپ کے سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا پس منظر کیا ہے؟

سرسیّد: ہمارا خاندان کوئی امیر کبیر بڑا جاگیردار خاندان نہیں تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں میرا تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تھا۔ والد، جیسا آپ کو معلوم ہے، درویش صفت انسان تھے۔ دنیاداری سے انہیں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ قلعہ معلّٰی کے متوسلین میں سے ضرور تھے۔ بہرحال قلعہ سے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی۔ تھوڑی بہت زمینیں بھی تھیں۔ جیسے تیسے گزارا چل رہا تھا۔ ۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد ان کی تنخواہ تقریباً بند ہوگئی۔ جو رقم بقدر قلیل والدہ کے نام جاری ہوئی وہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ زمینیں جو معافی کی تھیں وہ والد کے انتقال کے بعد حسب قاعدہ ضبط ہوگئیں۔ اس زمانے میں میرے بڑے بھائی سیّد محمد کا بھی کوئی خاص ذریعہ معاش نہ تھا۔ ان حالات میں گھر سنبھالنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں آگے بڑھوں اور کوئی ملازمت ڈھونڈوں۔

حالی: آپ کا خاندانی تعلق قلعہ سے تھا۔ آپ خود بھی قلعہ آتے جاتے رہتے تھے۔ بادشاہ آپ سے بنفس نفیس واقف تھے۔ کیا میں پوچھنے کی جسارت کرسکتا ہوں کہ آپ نے قلعہ معلّٰی سے وابستہ ہونے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

سرسیّد: بہت صحیح سوال ہے۔ اس کا میں دوٹوک جواب دیتا ہوں۔ ہر چند کہ میرے عزیز رشتہ دار قلعہ معلّٰی سے قطع تعلق کرنے پر راضی نہ تھے۔ قلعہ کا کمزور سہارا یک قلم چھوڑ کر محکمہ عدالت میں سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ یکسر میرا اپنا فیصلہ تھا۔ ہر چند کہ اس وقت تک عدالت کی کارروائیوں اور انگریزی قوانین سے میں ناواقف محض تھا۔

حالی: پھر؟

سرسیّد: پھر کیا؟ انسان جو کچھ کرنا چاہے محنت اور سمجھ سے کرسکتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے

عدالتی طریق کار سے واقفیت حاصل کرنے کی تدبیر کی۔

حالی: وہ کیا؟

سرسیّد: وہ یہ کہ میرے ایک قریبی عزیز مولوی خلیل احمد خان اس وقت دلی میں صدر امین تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کچہری میں مجھے کام سیکھنے کی اجازت دیں۔ انہوں نے بخوشی مجھے اجازت دے دی۔ یوں میں نے ان کی عدالت میں عدالتی کام سیکھنا شروع کر دیا۔ چند مہینے بعد میرا کام دیکھ کر خلیل اللہ خان صاحب نے صدر امین کی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کر دیا۔ یہ کچی نوکری تھی لیکن میری قوت بازو کا پہلا امتحان جس میں بحمدللہ میں پورا اترا۔

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ ودو میں

بخشش کی اچھی ملازمتِ قبول کرنے سے انکار

حالی: سیّد صاحب! مجھے کسی نے بتایا کہ آپ نے انہی دنوں ایک بہت بہتر ملازمت کی آفر کو قبول نہیں کیا۔ وہ کیا قصہ ہے؟

سرسیّد: بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ صدر امین کی کچہری میں کچی نوکری کرتے مجھے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ مسٹر رابرٹ ہملٹن (جو بعد کو سر رابرٹ ہملٹن ہوئے) دلی میں جج ہو کر آئے۔ چونکہ میری کچھ ان سے واقفیت تھی میں ان سے ملنے چلا گیا۔ بر سبیل تذکرہ انہوں نے مجھ سے پوچھا، کیا مشغلہ ہے۔ میں نے بتا دیا کہ صدر امینی میں کچی نوکری کر رہا ہوں۔ اور بہتر ملازمت کی تلاش میں ہوں۔ انہوں نے برجستہ کہا، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ابھی تمہیں عدالت سیشن کا سررشتہ مقرر کیے دیتا ہوں۔ میں نے شکریے کے ساتھ یہ منصب قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔

حالی: کیوں؟

سرسیّد: میں نے جو ہملٹن صاحب کو جواب دیا، آپ کو بتاتا ہوں۔ میں نے عرض کیا، یہ منصب میرے تجربے سے بہت اونچا ہے۔ اتنی بھاری ذمہ داری خواہ بلحاظ منصب کتنی ہی اچھی ہو، میں قبول کرنے سے معذرت چاہوں گا۔ جج ہملٹن صاحب میرے انکار پر بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے بہت اصرار اور دلدہی کی کہ کچھ تردد کی بات نہیں، ہم تم سے بہ سہولت کام لیں گے۔ اور ہر ایک بات بتاتے رہیں گے۔ میں نے پھر معذرت کی کہ جس کام کو کرنے کی فی الحال میں اپنے میں قابلیت نہیں پاتا وہ کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ یہ سن کر ہملٹن صاحب چپ ہو گئے۔ اور میں بدستور صدر امینی میں معمولی نوکری کرتا رہا۔

حالی: بڑی بات ہے۔

سرسیّد: ایسی بڑی بھی نہیں۔ ایک غیرت مند باعزت شخص کو بڑا منصب بخشش کے طور پر کبھی نہیں قبول کرنا چاہیے۔ عزت نفس سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں ہے۔

حالی: پھر کیا ہوا؟ آپ کی باقاعدہ سرکاری ملازمت کا آغاز کب ہوا؟

سرسیّد: مسبب الاسباب تو اللہ ہے۔ ہوا یوں کہ کچھ عرصے بعد ہملٹن آگرہ کے کمشنر ہو کر چلے گئے۔ لیکن از راہ کرم جاتے جاتے اپنے جانشین مسٹر لینڈزی سے کہتے گئے کہ سیّد احمد کیلئے کسی مناسب منصب کا بندوبست کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے ہملٹن صاحب نے مجھے آگرہ بلوالیا اور کمشنری کے دفتر میں جو عہدہ نائب منشی کا خالی ہوا اس پر مقرر کر دیا۔ یہ فروری ۱۸۳۹ء کی بات ہے۔ اس عرصے میں میں کچہری کے کام کا کافی تجربہ حاصل کر چکا تھا۔ میں نے برضا و رغبت اس ابتدائی اسامی کو قبول کر لیا۔ اس طرح میں نے اپنی ملازمتی زندگی کا سفر نائب منشی گیری سے شروع کیا۔

(حیات جاوید۔ صفحہ ۵۹)

سرسیّد نے اس حقیر سی اسامی پر اتنی محنت اور دوراندیشی سے کام کیا اور ایسے ایسے نئے کام پایہ تکمیل کو پہنچائے، جن کو بظاہر انکے منصب سے کوئی تعلق نہ تھا کہ چھوٹے بڑے سب ان کی جانفشانی اور قابلیت کے قائل ہو گئے۔ اور ان پر ترقی کے دروازے از خود کھلتے چلے گئے۔

حالی ''حیات جاوید'' میں اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''یہاں (بحثیت نائب منشی، کمشنری آگرہ) سرسیّد نے بہت جلد قوانین مال سے واقفیت حاصل کر لی۔ اس وقت کمشنری آگرہ کے ماتحت ضلعوں میں بندوبست کا کام جاری تھا۔ اور بندوبست ہی سے متعلق بہت سا کام کمشنری میں تھا۔ سرسیّد نے ترتیب دفتر کا ایک دستور العمل بنایا۔ اس کے موافق تمام دفتر کمشنری کا مرتب کیا گیا۔

انہی دنوں میں انہوں نے اپنے طور پر فارسی زبان میں ایک فہرست بطور نقشہ کے مرتب کی تھی جس کا نام جام جم رکھا۔ یہ ۱۸۴۰ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں امیر تیمور صاحب قرآن سے لے کر ابوظفر سراج الدین، بہادر شاہ تک مختلف خاندانوں کے ۴۲ بادشاہوں کا حال مختصر طور پر سترہ سترہ خانوں میں قلمبند کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ اس غرض سے تیار کیا کہ عہدہ منصفی پر ترقی پانے کی راہ ہموار ہو۔ جب وہ خلاصہ تیار ہو چکا تو کمشنر صاحب نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ گورنمنٹ میں پیش کیا اور سرسیّد کیلئے اس کاوش کی بنا پر عہدہ منصفی کی سفارش کی۔ چنانچہ حکم صادر ہوا کہ جہاں کہیں منصفی کا عہدہ خالی ہو سیّد احمد خان کو اس پر مقرر کیا جائے۔ لیکن ابھی اس عہدے پر ان کا تقرر ہوا بھی نہیں تھا کہ احکامات جاری ہو گئے کہ منصفی کے عہدے کیلئے امتحان ہوا کرے گا۔ اور ساتھ ہی قواعد امتحان بھی جاری ہو گئے۔

کمشنر نے کہا ''مسٹر سیّد احمد اب آپ کو منصفی کا امتحان دینا ہو گا۔''

سر سیّد نے جواب دیا، ''جناب! یہ سب سے بہتر ہے''۔
اور امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اور پہلی کوشش میں امتیازاً کامیاب ہوئے۔ دسمبر ۱۸۴۱ء میں ان کی منصفی کے عہدے پر پہلی تقرری نین پوری میں ہوئی۔ وہاں سے جنوری ۱۸۴۲ء میں تبدیل ہو کر فتح پور سیکری گئے۔''

(حیات جاوید۔ صفحہ ۶۰)

مسجدوں کی تعمیر

جب تک سرسیّد قوم کے عشق میں مبتلا نہیں ہوئے تھے وہ ایسے کارہائے ثواب جیسے مسجد کی تعمیر اور مستحقوں کی امداد میں پیش پیش رہتے تھے۔ حالی نے ''حیات جاوید'' میں سرسیّد کے ایک دیرینہ دوست محمد معبد خان کا ایک بیان نقل کیا ہے:

''بجنور میں غدر سے پہلے تین مسجدوں کے بننے میں انہوں نے کافی مدد دی۔ موضع بیسویہ جو بجنور اور دلی کے رستے میں پڑتا تھا، وہاں ایک سرائے تھی جس میں سرسیّد آتے جاتے کھانا کھانے کیلئے ٹھہرا کرتے تھے۔ اس سرائے میں بھٹیاروں نے ایک مسجد بنانی شروع کی تھی۔ اس مسجد کی ابھی بنیادیں بھری گئی تھیں کہ دو بھٹیاروں کو وہاں کے برہمنوں نے مار ڈالا۔ اس لئے مسجد کی تعمیر بند ہوگئی۔ سرسیّد نے اس کی تعمیر ناتمام دیکھ کر کچھ روپیہ اپنے پاس سے دیا۔ اور کچھ دلی سے اپنے رشتے داروں، مردوں اور عورتوں سے وصول کر کے اس کو پورا کر دیا۔ پھر، خاص بجنور میں بکر قصابوں نے ایک مسجد کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کے بنوانے میں بھی انہوں نے بہت مدد دی۔ مگر وہ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ ''غدر'' ہوگیا۔ غدر کے بعد سرسیّد نے فوراً اس کی تعمیر جاری کرائی اور اس کو مکمل کرا دیا۔ اسی طرح کاندھلہ میں ایک مسجد مولوی مظفر حسین بنواتے تھے۔ سرسیّد نے کچھ روپیہ بھیجنا چاہا، مولوی صاحب نے کہا کہ تمھاری تنخواہ کا روپیہ مسجد میں نہیں لگایا جا سکتا۔ سرسیّد نے رجسٹری کی آمدنی میں سے وہاں کئی سو روپیہ بھیجا۔''

مستحقوں کی دستگیری

دادو دہش میں سرسیّد کا ہاتھ اور دل پہلے سے کھلا تھا۔ لیکن خصوصاً ''غدر'' کے بعد جب کہ مسلمان شرفا کے صدہا خاندان تباہ و برباد ہو گئے تھے، ان کی دلسوزی اور دردمندی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

حالی نے سرسیّد کے قریبی دوست محمد سعید خان کے حوالے سے لکھا ہے:

''مراد آباد میں جو کوئی شکستہ حال اشراف صورت مسلمان ان کے مکان کے برابر سے گزرتا اس کو خود بلا لیتے تھے۔ اور علیحدہ لے جا کر اس کا حال دریافت کرتے تھے۔ اور ایسے طور پر اس کے ساتھ سلوک کرتے تھے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔

مدت تک غدر کے بعد ان کا یہ حال رہا کہ اپنی تنخواہ میں سے صرف بقدر اخراجات ضروری لے کر باقی کل روپیہ دلی میں تقسیم کرنے کیلئے بھیج دیتے تھے۔ بعض افراد غدر کے آفت رسیدہ لوگوں کے ساتھ سرسیّد کا برتاؤ دیکھ کر کر بہ تصنع اپنے تئیں مفلوک الحال اور مصیبت زدہ ظاہر کرتے تھے اور سرسیّد ان کے اصل حال سے واقف ہونے کے باوجود ان کے ساتھ اسی طرح سلوک کرتے تھے۔''

محمد سعید خان صاحب کا بیان ہے کہ:

''مراد آباد میں جب کہ نواب لیفٹیننٹ گورنر کا دربار ہونے والا تھا اور لوگ اطراف و جوانب سے دربار میں شامل ہونے کو آئے ہوئے تھے، ایک شخص بظاہر معقول اور سفید پوش سیّد صاحب کے مکان پر آیا اور ان کو الگ لے جا کر کہا کہ میں دربار میں شریک ہونے کے لئے آیا تھا، مگر میرا آدمی اسباب لے کر بھاگ گیا اور میں بالکل بے سروسامان رہ گیا ہوں۔ سرسیّد نے اس کو معقول خرچ دیا اور کھانا اپنے ساتھ کھلایا۔ جب وہ چلا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی نواح کا رہنے والا ہے اور اسی طرح لوگوں کو جل دے کر مانگ کر کھاتا ہے۔ تین چار روز بعد وہ صاحب پھر تشریف لائے اور کچھ طلب کیا، سیّد صاحب نے پھر کچھ خرچ دیا اور کھانا بھی ساتھ کھلایا۔ غرض کہ تین دفعہ دربار ہونے سے پہلے وہ ان کے پاس آیا اور ہر دفعہ اس کو کچھ دیا۔ اور کھانا اسی طرح ساتھ کھلایا۔''

اس زمانے میں سرسیّد کو خیال تھا کہ سینکڑوں شریف خاندان افلاس میں مبتلا ہیں۔ اور جس حیلے سے روٹی ملتی ہے حاصل کرتے ہیں۔

سرسیّد کی جوانمردای اور فیاضی صرف داد و دہش ہی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان کی مثال ایک پھلدار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے، اپنے سایہ سے اور اپنی لکڑی سے، غرض ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ غدر کے بعد انہوں نے اکثر بے گناہ مسلمانوں کی، جن کی نسبت حکام کو اشتباہ ہو گیا تھا، صفائی کرائی۔ بعض اشخاص جو فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ کے خوف سے فوج میں شامل ہو گئے تھے مگر درحقیقت بے گناہ تھے، ان کو بطور خاص وہاں سے بلوا کر ان کی تحقیقات کروائیں۔ اور ان کی بریت پر خود گواہی دے کر ان کو بری کرایا۔ مراد آباد کے مسلمانوں کو بعض ناخدا ترس ہندوستانیوں کے شر سے بچایا جو محض مذہبی تعصب کے سبب ان کو پھانسیاں دلوانے پر کمر بستہ تھے۔ بعض مسلمان جو سرکاری فوج کے ہاتھ سے دلی پر حملہ ہونے کے وقت بے قصور مارے گئے، ان کے درماندہ وارثوں کی پنشنیں مقرر کرائیں۔ مولانا عالم علی مراد آبادی کی صفائی کرانے میں سرسیّد نے بے انتہا کوشش کی۔ غرض اس شخص نے مسلمانوں کو، کیا من حیث القوم اور کیا من حیث الافراد، فائدہ پہنچانے میں کبھی کمی نہیں کی۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا، اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر علی گڑھ میں مقیم ہوئے، مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کو ان کی توقع اور حوصلہ سے بہت زیادہ دیتے تھے۔ اور جہاں کہیں انکا رہنا ہوا، یہ لوگ ان کے نہایت ثناخواں اور شکر گزار رہے۔ ان کے ایک دوست کا بیان ہے کہ:

''میں بنارس میں ان سے ملنے گیا تھا۔ دریا پر پہنچا تو شام ہو گئی اور کشتی کی آمدورفت بند ہو گئی۔ ہر چند ملاّحوں سے کہا کہ کشتی لگا دو، مگر انہوں نے نہ مانا۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ جج صاحب کے ہاں جانے والے ہیں تو فوراً کشتی اتار دی اور مجھے پار لگا دیا۔ کشتی سے اتر کر میں نے ملاّحوں کو کچھ دینا چاہا مگر انہوں نے کچھ نہ لیا اور کہا کہ سرکار (یعنی سرسیّد) ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں۔ ہم ان کے مہمان سے ہرگز کچھ نہ لیں گے۔''

ایسا ہی ایک واقعہ ریل کے مزدوروں کا سنا ہے۔ جو سرسیّد کے نام پر بلا مزدوری کام کرتے تھے۔ سالم نامی ایک یہودی صنعائے یمن کا رہنے والا غازی پور میں سرسیّد کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کیلئے پھرا ہوں، کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسیّد نے پوچھا کہ کیا تنخواہ لو گے۔ اس نے دس یا پندرہ روپے کہے۔ سرسیّد نے کہا میں تم کو پچیس روپے مہینہ دوں گا، مجھے عبرانی سکھاؤ۔ سرسیّد کے ایک دوست کہتے ہیں کہ اس نے خوشی کے مارے بڑھ کر سرسیّد کی ڈاڑھی چوم لی اور یہ کہا کہ آج تک مجھے ایسا شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ دیا ہو۔ سرسیّد نے اس کو نوکر رکھ لیا۔ مگر چونکہ وہ مسرف اور آوارہ مزاج تھا اس لئے اس کو بقدر ضرورت دیتے رہے۔ اور اس کی باقی تنخواہ جمع کرتے رہے۔ جب وہ وطن کو جانے لگا تو کوئی سو روپیہ جو اس کا چڑھا ہوا تھا حساب کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

جس زمانے میں سرسیّد مولوی نوازش علی سے دلی میں پڑھتے تھے، میر محمد امام جامع مسجد دہلی بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سرسیّد صاحب چند روز کے لئے قائم مقام صدر امین ہو کر رہتک جانے لگے تو انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلئے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیونکر جا سکتا ہوں۔ ایک جماعت کثیر طلباء کی مجھ سے پڑھتی ہے۔ ان کو کس طرح چھوڑ کر جاؤں۔ انہوں نے کہا کہ سب طلباء کو بھی ساتھ لے چلیے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے۔ سیّد صاحب نے کہا کہ آپ انکے کھانے پینے کی تو فکر کیجیے نہیں، خدا رازق ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کر دوں گا۔ اور اس سے میری آئندہ ترقی رک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ مع طالب علموں کی جامعت کے، ان کے ساتھ ہو لیں۔ اور جب تک رہتک رہنا ہو سب کا خرچ سیّد صاحب کے ذمے رہا۔

حالی لکھتے ہیں:

''سرسیّد کی اس قسم کی فراخ حوصلگی کی مثالیں بے شمار ہیں۔ اگرچہ یہ خصلت عام مسلمانوں کے حق میں ان کی موجودہ حالت کے لحاظ سے نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ اب مسلمان بغیر کفایت شعاری کے صفحہ ہستی پر قائم نہیں رہ سکتے۔ مگر سرسیّد کی حالت عام مسلمانوں سے بالکل مستثنیٰ تھی۔''

در حق اُو مداح و در حق تو ذم
در حقِ اُو شہد، در حقِ تو سم

سرسیّد اگر گھر کے انتظام اور نون، تیل، لکڑی کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ تمام ملکی اور مذہبی خدمات جو انہوں نے گزشتہ چالیس برس میں سرانجام دیں، وہ کون کرتا؟ انہوں نے ایسے کاموں کیلئے جو ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں میں بالکل نئے تھے اور جن پر خرچ کرنے کی ان کی بالکل عادت نہ تھی، دس بارہ لاکھ سے کم روپیہ وصول نہ کیا ہوگا۔ اگر وہ کفایت شعاری کا کام فرماتے اور اپنی پاکٹ بالکل نہ جھاڑ دیتے تو اوروں کے کیسوں میں کیونکر ہاتھ ڈال سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے گھر کو مہمان سرانہ بناتے تو علی گڑھ کا ایک ویران قطعہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز کیونکر بن سکتا تھا۔ اگر وہ ہزار ہا روپیہ اپنے پاس سے صرف کر کے اطراف ہندوستان میں چندہ کیلئے سفر نہ کرتے بلکہ اپنا سفرخرچ کمیٹی کے ذمے ڈال دیتے تو مسلمانوں میں جو ہر وقت اعتراض کرنے کا موقع ڈھونڈتے تھے، کیونکر اپنا وقار قائم رکھ سکتے تھے۔

بہرحال اس باب میں سرسیّد کی ایک خاص عادت تھی۔ اگر کوئی دوسرا شخص بھی گھر بار لٹا کر قوم کو اسی طرح فائدہ پہنچا سکے تو بلاشبہ قوم کا سرتاج ہے۔ اور بے شک روپیہ صرف کرنے کا طریقہ اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔

اگرچہ سرسیّد کی زندگی برابر آسودگی کے ساتھ گزری۔ مگر خدا تعالیٰ نے ان کا حوصلہ بمقابلہ ان کی حیثیت کے، زیادہ فراخ اور وسیع و بلند پیدا کیا تھا۔ اس لئے ان کی آمدنی کبھی ان کے اخراجات کیلئے کافی نہیں ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ مقروض رہنا ایک لازمی سی بات ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ایک دوست کو، جو مقروض ہوگئے تھے، اس طرح لکھتے ہیں:

''قرضے کی پریشانی بلاشبہ بہت رنج ہے۔ جس کے مزے سے میں خوب واقف ہوں۔ بہت کم مسلمان ہوں گے جو اس رنج میں مبتلا نہ ہوں، مگر میں تو اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہوں کہ مقروض ہونا بھی خدا کی رحمت ہے۔ میں اس حدیث پر پورا یقین رکھتا ہوں کہ ''صاحب المال کافر'' جس پر حضرت ابوذر غفاریؓ کا یقین اور عمل تھا۔ کافر کے لفظ سے کیا

مراد ہے، اس بحث کو چھوڑ دو، جو اس کی مراد ہو وہ ہو، ہم ابوذرؓ تو نہیں بن سکتے۔ مگر خدا کی رحمت ہے جو اس نے ہم کو مقروض رکھ کر کفر سے بچایا ہے۔ پس میرے دل کی تسلی کو تو یہ خیال کافی ہے۔''

معلوم نہیں کہ سرسیّد کو اس حدیث کے یقین نے مال جمع کرنے سے باز رکھا تھا یا جب مال جمع نہ رہا تو تب اس حدیث کا یقین ہوا؟ درحقیقت یہ ان کا حسنِ بیان تھا جس سے مخاطب کو تسلی دینا مقصود تھا۔ ورنہ روپے پیسے کی محبت سرے سے ان کی سرشت ہی میں نہیں پیدا کی گئی تھی۔ اور وہی اثر ان کی اولاد میں تھا کہ باوجود معمولی آمدنی کے، ہمیشہ مقروض اور تہی دست رہے۔

سرسیّد کے ایک دوست ایک زمانے میں ان کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ جب مہینہ ختم ہوا، تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر ان کے دکھانے کو لے گیا، سرسیّد نے کہا:

''بس، مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں، یوں ہی چلنے دو۔ میں دیکھوں گا تو ناحق مجھ کو صدمہ ہوگا۔''

حق تو یہ ہے جو شخص رات دن اوروں کی اصلاح کی فکر میں رہے گا، وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہوسکتا ہے۔

مخالفوں اور رشتہ داروں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی ان سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا، یہ بھی سرسیّد کے ان اوصاف میں سے تھا جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ اس شخص کے صرف اقوال ہی سے نہیں بلکہ زیادہ تر اس کے افعال سے ثابت ہوتا ہے کہ برائی کا بدلہ لینا تو درکنار، اسکو کسی کی برائی یاد بھی نہیں رہتی تھی۔

ان کے ایک دوست راوی ہیں:

''مراد آباد میں جب کہ سرسیّد وہاں صدرالصدور تھے محکمہ صاحب جج کے ایک ہندو کلرک کو سرسیّد سے کچھ زیادہ رنجش تھی۔ وہ اکثر گمنام عرضیاں ان کی شکایات کی اعلیٰ افسروں کو لکھتا رہتا تھا۔ ایک بار جب کہ پولیس کا نیا انتظام ہوا تھا اس نے ڈسٹرکٹ پولیس کو ایک عرضی لکھ بھیجی کہ صدر اعلیٰ کے بھتیجے نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے۔ اور ان کے گھر میں اس کی لاش موجود ہے۔ فوراً تلاشی لی جائے۔ اسی وقت پولیس کا عملہ ان کے مکان پر چڑھ آیا۔ سرسیّد نے مکان میں پردہ کرا دیا۔ اور تلاشی لی گی۔ مگر چونکہ محض اتہام تھا، کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔ سرسیّد اور ان کے اکثر دوستوں کو خوب معلوم ہوگیا تھا کہ فلاں کلرک نے یہ عرضی لکھی تھی۔ مگر سرسیّد نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ جب وہ غازی پور بدل گئے اور کسی وجہ سے وہ کلرک نوکری سے علیحدہ ہو گیا تو ایک موقع پر جب کہ سرسیّد کے ایک معزز دوست کسی اعلیٰ عہدہ پر ترقی پا

کر غالباً سنٹرل انڈیا کو جاتے تھے اور جاتے ہوئے غازی پور میں ٹھہرے تھے، ان کو ایک لائق انگریزی دان کی ضرورت ہوئی۔ چونکہ سرسیّد اس کلرک کی انگریزی لیاقت سے واقف تھے، انہوں نے اس کی سفارش کی اور اس کے گھر بلوایا۔ چنانچہ وہ صاحب اس کو دوسو روپیہ ماہوار کا نوکر رکھ کر لے گئے۔''

جو صاحب اس حکایت کے ناقل ہیں، یہ کہتے تھے کہ:

''مدت بعد وہ کلرک مجھ سے ملا تو اس نے صاف صاف بیان کیا کہ میں نے سیّد احمد خان کے ساتھ برائی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا مگر اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ مجھے دوسو کا نوکر رکھوا کر بھیج دیا۔ اس نے کہا کہ حقیقت میں سیّد احمد خان ایسا شخص ہے کہ جس کے سر پر اس کی جوتیوں کی خاک پڑ جائے، اس کی نجات ہو جائے۔''

جب ''رفیق ہند'' میں سرسیّد کے خلاف سخت سخت آرٹیکل شائع ہونے لگے اور منشی سراج دین، ایڈیٹر سرمور گزٹ نے اس کا جواب لکھنے کیلئے قلم اٹھایا تو سرسیّد ان کو لکھتے ہیں۔

''میں نے آپ کا اخبار مورخہ ۸ جنوری پڑھا۔ بلاشبہ آپ کی محبت کا جو آپ کو مجھ ناچیز سے ہے، ممنون اور احسان مند ہوں اور آپ کو اس تحریر کی نسبت جو اس پرچے میں ہے، بوجہ جوش محبت معذور سمجھتا ہوں۔ مگر جانے دو، جس کا دل چاہے کہے، ہمارا کیا بگڑتا ہے؟ اگر ہمیں برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے، خوش کر لینے دو، تم بھی اس برا کہنے سے خوش رہو، کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں۔ ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں نے وہ خط جناب خان بہادر برکت علی خان کے پاس بھیج دیا۔ اگر ان کا ذکر نہ ہوتا تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ تم میرے ساتھ محبت رکھتے ہو۔ اس کا بھی تم کو یقین ہے کہ جو لوگ میرے نسبت عیب لگاتے ہیں مجھ وہ میں نہیں ہیں۔ تو تمہارے خوش رہنے کیلئے اور مجھ کو خدا کا شکر ادا کرنے کیلئے کہ وہ عیب اس شخص میں جس کو تم دوست رکھتے ہو، نہیں ہیں، کافی ہے۔ اس سے زیادہ کیا خوشی کی بات ہے۔ پس برا کہنے والوں کی بری بات کا یہی نیک پہلو نکالو اور خوش رہو۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔''

جب منشی سراج الدین نے اس کا جواب لکھا تو سرسیّد نے ان کو اسی مضمون کے متعلق دوسرا خط لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

''ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں۔ برا کرنے والوں کی برائی سے ہمیں کیا کام؟ ہم کو اپنا دل، اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیے۔ برائی کرنے والوں پر افسوس کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے آپ کو بھی ویسے ہی کرنا ہے۔ جو لوگ

برا کہنے والے ہیں، اس کی نسبت ہم کو صبر و تحمل کرنا چاہئیے۔ اگر وہ برائی ہم میں ہے، اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے۔ اگر نہیں ہے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ وہ برائی ہم میں نہیں ہے۔ برا کہنے والے کی نسبت خیال نہیں کرنا چاہئیے کہ کون ہے؟ دنیا میں ہے بھی یا نہیں؟ پس یہی آرام و آسائش کا طریق ہے۔ اگر تم بھی چاہتے ہو کہ دنیا میں آرام سے رہو، یہی طریقہ اختیار کرو۔ میں یقین کرتا ہوں مگر افسوس کے ساتھ کہ...... صاحب کی طبیعت خدا نے ایسی بنائی ہے کہ ان سے بھلائی یا سچائی کی توقع نہیں، کچھ بھی کرو، آزار ہی پہنچے گا۔ پس گلہ کیا ہے؟ کیا تم دنیا کے بچھوؤں سے گلہ کرتے ہو؟ اور کیا وہ کسی کی دشمنی سے ڈنک مارتے چلتے ہیں؟ پس ان کے حال سے بحث مت کرو۔ لوگوں کا جیسا دل چاہے ویسا ان کے ساتھ برتاؤ کریں۔ اگر ہم سے معافی چاہتے ہیں۔ ہمارا انہوں نے کیا گناہ کیا؟ کیا میری ڈاڑھی منڈھ گئی؟ آپ آ کر دیکھ لیں، بدستور ہے۔ بلکہ جو درجو بڑھ ہی گئی ہو گی۔ مجھے تمام عمر افسوس رہے گا کہ میں نے وہ خط کیوں برکت علی خان صاحب کے پاس بھیج دیا۔ اگر خان صاحب ممدوح کی نسبت اس میں متوحش بات نہ لکھی ہوتی تو میں ہرگز نہ بھیجتا۔ خیر جو ہو گیا اس پر افسوس سے کیا فائدہ۔

میرے نزدیک منشی...... کی کسی بات کے درپے نہیں ہونا چاہیے، خدا کی دنیا میں بہت مختلف اقسام کی خلقت ہے۔ ہر ایک اپنا کام کرتا ہے۔ تم اپنا کام کرو۔ مگر جان لو تمہارا کام کیا ہے۔ نیکی، بھلائی اور اپنے کام سے مطلب۔ دوسرے کے کام سے کچھ غرض نہیں۔ جس سے دل رکا ہوا ہو، اس سے مت ملو۔ کیونکہ اس سے مل کر خوشی نہ ہوگی۔ یا منافقانہ طریقہ ظاہر داری کرنا پڑے گی۔ نہ ملنے میں بہ نسبت ملنے کے، آرام ہے۔ اس طرح ان کی باتوں کی پرواہ نہ کرنے میں بالکل آرام ہے۔"

اگرچہ سرسیّد فطرتاً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض ان کی سرشت میں داخل تھا مگر ان کی والد کی ابتدائی روک ٹوک اور حسن تربیت سے یہ تمام ان کی طبیعت میں اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے۔ اسی نیک اور عاقل ماں نے بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بُروں کی برائی سے بالکل درگزر کی جائے۔ اور اگر بدلہ ہی لینے کا خیال ہو تو اس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی نے لڑکپن میں یہ سبق سکھایا کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی کرنا خود اپنے آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔ اسی تعلیم و تلقین کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے واجب القتل ہونے کے فتوے حرمین میں جا کر لکھوائے، جنہوں نے اس کو کافر و ملحد، کرستان اور دجال ٹھہرایا، جنہوں نے گمنام خطوں میں اس کو گالیاں لکھ کر بھیجیں اور قتل کی دھمکیاں دیں،

ان کی نسبت اس نے علی الروس الاشہاد کہا۔

''میں اپنے کسی بھائی سے، کسی ہم جنس سے نہ دنیا میں بدلہ لینا چاہتا ہوں نہ قیامت میں۔ میں نہایت ناچیز ہوں مگر اس رسول ﷺ کی ذریت میں سے ہوں جو رحمت اللعالمین ہیں۔ میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا، اور تمام لوگوں کو جنہوں نے مجھے برا کہا، جنہوں نے مجھ پر اتہام کیا یا آئندہ کریں گے، سب کو معاف کروں گا۔''

فی الحقیقت اچھی ماں اولاد کے حق میں خدا کی رحمت ہے جو اس میں عمدہ اخلاق کی بنیاد ڈالتی ہے۔ اور برائیوں کا رخ نیکی کی طرف پھیر دیتی ہے۔ سرسیّد کے بچپن اور جوانی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت غیض وغضب پر محمول تھی مگر ماں کے حسن تربیت نے گویا ان کی ماہیت بالکل بدل دی تھی۔ عمدہ تربیت جس طرح گھوڑے کی توسنی اور سرکشی کو چالاکی سے بدل دیتی ہے۔ اسی طرح انسان کے غیض وغضب کو اولوالعزمی اور دلیری کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ اور وہی چیز جو پہلے درندوں کی خصلت معلوم ہوتی تھی اب بڑے بڑے عظیم الشان ارادوں کی شکل میں ظہور کرتی ہے۔ سرسیّد میں یہ انقلاب نمایاں طور پر نظر آتا تھا۔ ان کا جبلی غیظ وغضب فی الواقع ہم جنسوں کی حمایت اور جوش ہمدردی کے ساتھ بدل گیا تھا۔ ان کو پرائیویٹ معاملات میں سوائے اس کے کہ کبھی کبھی نوکروں پر دودھ کا سا ابال آ جاتا تھا، بہت ہی کم غصے میں ہوتے دیکھا۔ جو کچھ ان کا غصہ یا افسوس تھا وہ قوم کی غفلت یا نالائقی پر تھا، یا ان کی تباہی و بربادی پر، یا قومی کاموں کی مخالفت اور مزاحمت پر، یا قوم کے بے جا تعصبات اور ان کی پولیٹکل بے وقعتی پر۔

ممکن ہے کہ بتقاضائے بشریت کسی کی طرف سے ان کے دل میں کچھ رنج ہو، مگر انکے ظاہ حال اور قول وفعل سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی اس شخص کو کسی کا ذکر برائی کے ساتھ کرتے نہیں دیکھا۔ جو لوگ ان کو لوگوں کے سامنے علانیہ گالیاں دیتے تھے ان کا نام بھی وہ ہمیشہ ادب کے ساتھ لیتے تھے۔ اس کے دل کی صفائی کا سب سے بڑا گواہ انکا اخبار تھا جو پچیس برس جاری رہا۔ مگر کبھی کسی کی مذمت یا برائی اس میں نہیں لکھی گئی۔ وہ جس طرح اپنے اخبار کو چھیڑ چھاڑ اور ہزل وحرف گیری وکج بحثی سے پاک رکھتے تھے اسی طرح اپنے اخبار نویس دوستوں کو ان لغویات سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ایک اخبار کے ایڈیٹر کو لکھتے ہیں جس میں کسی کا ہزل آمیز خط چھپ گیا ہے۔

''کیا آپ کا اخبار بھی مثل دیگر نالائق اخباروں کے، نامہذب ہونے کو ہے؟ نہایت افسوس اور کمال درجہ افسوس ہے کہ مضمون ...... آپ کے اخبار ۳۰ اپریل میں چھپا ہے۔ آپ کا اخبار روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، لوگوں کا خیال اس طرح رجوع تھا۔ کیا اس کا ارادہ ہے کہ اپنی تمام عزت وقدر کھودے؟''

اسی ایڈیٹر کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''میں دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ آپ اپنے اخبار کو مہذب بنائیں، بدگو کے ساتھ اگر بدگوئی کی تو دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ میری نسبت لوگ کیا کیا کچھ نہیں لکھتے ہیں؟ کیا مجھے لکھنا نہیں آتا؟ ہندوستانی ریاستیں، ہندوستان میں غنیمت ہیں، ہمیشہ ان کے ساتھ دوستانہ برتاؤ چاہیے۔''

ایک دفعہ منشی سراج الدین احمد ایڈیٹر مورگزٹ نے اپنے اخبار میں ریاست بہاول پور کی شکایت لکھ دی کہ وہاں سے علی گڑھ کالج کیلئے چندہ نہیں پہنچا۔ سرسیّد نے فوراً ان کو متنبہ کیا اور لکھا کہ:

''سرکار بہاول پور نے دو دفعہ ہزار ہزار روپیہ کالج کیلئے اور چند روز ہوئے کہ ایک ہزار روپیہ واسطے تعمیر مسجد کے، مرحمت کیا ہے، جو اس کی اطلاع آپ کو ضروری تھی، اس کیلئے فی الفور یہ مختصر نیاز نامہ روانہ کرتا ہوں۔''

الغرض ان کے تمام جذبات اور تمام Passion ایک قومی ہمدردی کے جوش میں بالکل جذب ہو گئے تھے۔ ان کا غصہ تھا تو قوم کیلئے، شکایت تھی تو قوم کیلئے، حرص وطمع تھی تو قوم کیلئے اور خودغرضی تھی تو قوم کیلئے، اپنے لئے کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

(حیات جاوید)

انگریزوں کے ساتھ کھانا پینا

حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''۱۸۶۶ء میں سرسیّد کے پاس ایک سوال بطور استفسار کے آیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ بشرطیکہ کھانے میں کوئی حرام چیز نہ ہو، کھانا پینا درست ہے یا نہیں؟ سرسیّد نے اس کا جواب آیات واحادیث کے حوالے سے لکھ دیا کہ جائز ہے۔ اور ہندوستان کے سوا تمام دنیا کے مسلمان، انگریزوں کے ساتھ برابر کھاتے پیتے ہیں۔ یہ جواب ۱۶ ستمبر ۱۸۶۶ء کے سوسائٹی اخبار میں چھپا۔ اس پر ایک سیّد صاحب نے ایڈیٹر کے نام لکھنؤ سے چٹھی لکھی اور سرسیّد کے جواب پر نہایت خوشی ظاہر کی۔ اور لکھا کہ میں اس دن کے دیکھنے کا نہایت مشتاق ہوں جب یہ سنوں کہ سیّد احمد خان نے اپنے قول کے مطابق عمل بھی کیا۔

اس کے جواب میں سرسیّد نے لکھا کہ میں نے اسلام کو ماں باپ کی تقلید سے نہیں بلکہ بقدر اپنی طاقت کے خود تحقیق کر کے تمام مذاہب معلومہ سے اعلیٰ، عمدہ اور سچا یقین کیا۔ اور اسی سچے مذہب نے مجھے سکھایا ہے سچ کہنا اور سچ کرنا۔ نہایت کمینہ آدمی ہے جو کہتا کچھ ہو اور کرتا کچھ ہو۔ اور اس سے بھی زیادہ کمینہ وہ شخص ہے جو شریعت کے حکم سے واقف ہو اور پھر رسم و رواج کی شرم سے یا لوگوں کے لعن وطعن کے ڈر سے اس کے کرنے میں تامل کرے۔ اسی لئے میں کسی انگریز کے ساتھ کھانے پینے بشرطیکہ شراب اور سور یا اور کوئی حرام چیز نہ ہو، کچھ

تامل نہیں کرتا۔ میرے انگریز دوست میرے ہاں مہمان ہوتے ہیں اور میں انکے ہاں مہمان ہوتا ہوں۔ اور ہم اور وہ ایک میز اور ایک دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ جس چیز میں ہم کو خدا سے شرم نہیں اس میں دنیا کے لوگوں سے کیا ڈر ہے۔"

(حیات جاوید، صفحہ ۱۴۶)

عزت نفس کا مسئلہ

فروری ۱۸۶۷ء میں آگرہ میں ایک بڑی نمائش ہوئی۔ سرسیّد نمائش کمیٹی کے ممبر تھے۔ نمائش کے آخری دن سرکاری دربار تھا۔ دربار کا انتظام کلکٹر آگرہ مسٹر یاکب کے سپرد تھا۔ انہوں نے دربار میں نشستوں کا انتظام اس طرح کیا کہ انگریزوں اور دیسی عمائدین کی نشستوں میں امتیاز کیا۔ سرسیّد نے اس پر اعتراض کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے بورڈ کے صدر مسٹر تھارن ہل تک پہنچی۔

تھارن ہل: (نہایت برافروختہ ہوکر) تم لوگوں نے غدر میں کونسی برائی ہمارے ساتھ نہیں کی جو اب تم چاہتے ہو کہ ہمارے اور ہمارے عورتوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھو۔

سرسیّد: اسی سبب سے تو یہ ساری برائیاں پیدا ہوئیں کہ آپ لوگ ہندوستانیوں کو ذلیل سمجھتے رہے۔ اگر ان کو اس طرح ذلیل نہ سمجھا جاتا تو کیوں یہاں تک نوبت پہنچتی۔

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۳۴۰)

ہومیوپیتھی سے دلچسپی

حالی "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں:

"سرسیّد کی طبعیت کا خاصہ تھا جو بات یا کام یا جو تجویز ملک کیلئے مفید سمجھی اس کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔"

حالی: سیّد صاحب، ہومیوپیتھی سے دلچسپی آپ کو کب پیدا ہوئی؟

سرسیّد: غالبًا ۱۸۶۷ء کی بات ہے۔ میں بنارس میں تعینات تھا کہ ہومیوپیتھی کے بارے میں پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہومیو پیتھک علاج کے طریقہ سے بہتر کوئی طریقہ علاج عمدہ اور بے خطر نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اس طریقہ علاج کی حمایت کرنے اور تقویت دینے کا ارادہ کیا۔ اسی سال ۱۸۶۷ء میں میں نے ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ہومیو پیتھک طریقہ علاج ہندوستان میں پھیلانا اور ہندوستانیوں کو اس کی طرف مائل کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے پریذیڈنٹ راجہ صاحب اور سیکرٹری میں خود تھا۔ کمیٹی کے زیر اہتمام ۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو بنارس میں ایک شفاخانہ بنارس ہومیو پیتھک ڈسپنسری اینڈ ہاسپٹل کھولا گیا۔ میں نے ہر طریقہ سے جو میرے اختیار میں تھا، لوگوں کو اس طرف توجہ دلائی۔

(حیات جاوید، صفحہ ۱۳۸)

دو قومی نظریہ

حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد ایک عرصہ تک اس اصول کے پابند رہے کہ ہندوستان کی بھلائی کسی طرح ممکن نہیں بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مل کر رہیں۔

آہستہ آہستہ ان کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ رہا۔''

حالی: سیّد صاحب! کیا اسباب تھے کہ آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہیں۔

سرسیّد: انگریزی مدارس کی تعلیم سے جو ہندو مستفید ہوئے انہوں نے ہندوستانی تاریخ کی جو متعصّبانہ تاریخ پڑھی اس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ ہندوؤں میں خاص طور پر مسلمانوں کے مخالف سخت تعصب پرورش پانے لگا۔ ۱۸۳۵ء میں دفتر اور عدالت کی زبان اردو تھی اور اس کو ہندوستان کی قومی زبان مانا گیا تھا۔ انہوں نے اپنی علیحدہ قومیت کے جذبے کے اظہار کے لئے سب سے پہلے اردو زبان اور خط کو نشانہ بنایا۔

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے کی کوشش کی جائے۔ اور بجائے اس کے، بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو، مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کیلئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ انہی دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا کہ گر آپ کی یہ پیش گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔

اردو اور مسلم قومیت

''سرسیّد احمد خان (حالات و افکار)'' میں مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''شروع شروع میں سرسیّد ہندو مسلم اتحاد کے سرگرم حامی تھے۔ انہوں نے اپنی تقریروں اور مضامین میں بار بار باہمی اتحاد کی تلقین کی۔ اور یہ سمجھایا کہ ہندوؤں، مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اپنے تئیں ایک قوم سمجھیں۔ اور بھائی بھائی کی طرح مل کر کام کریں۔''

لیکن جب ہندوؤں کی طرف سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کے خارج کر دینے کی تحریک ہوئی تو سرسیّد کے دل کو بڑی ٹھیس لگی۔ مولانا حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندوؤں، مسلمانوں کو بطور ایک قوم کے، ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر چلانا اور دونوں کو ملا کر سب کیلئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔''

حالی نے ''حیات جاوید'' میں بنارس کے کمشنر شیکسپیئر سے انکی گفتگو نقل کی ہے۔

مسٹر شیکسپیئر: سیّد صاحب آج پہلا موقع ہے کہ میں نے آپ سے خاص، مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا حال سنا ہے۔ اس سے پہلے آپ ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال رکھتے تھے۔

سرسیّد: آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوؤں کی طرف سے بڑی شد و مد سے سرکاری دفتروں اور مدارس سے اردو کو خارج کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس تحریک سے مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ بلکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور فساد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، دیکھے گا۔

مسٹر شیکسپیئر: اگر آپ کی پیش گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔

سرسیّد: مجھے بھی بہت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔

(مولوی عبدالحق۔ سرسیّد احمد خان۔ صفحہ ۶۳)

قحط زدہ انسانوں کی خدمت

۱۸۶۰ء میں یوپی کے شمالی اضلاع میں ایک عام قحط پڑا تھا۔ اس وقت سرسیّد مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان سٹریچی نے جو اس وقت وہاں کلکٹر تھے، اپنے ضلع کے قحط کا انتظام سرسیّد کے سپرد کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی کارکردگی کی بڑی شہرت تھی۔ حسن اتفاق سے حالی کی ملاقات سرسیّد کے ایک ایسے دوست سے ہوئی جو اس کارکردگی کے عینی شاہد تھے۔

حالی: بات تو پرانی ہے۔ آپ کو اس زمانے کے قحط میں سرسیّد کی کارگزاری کا کوئی واقعہ یاد ہے؟

دوست: میں خود مراد آباد کا رہنے والا ہوں۔ اس زمانے میں وہاں تعینات تھا۔ سرسیّد کو میں نے دن رات قحط کا انتظام و انصرام کرتے دیکھا ہے۔ قطع نظر لیاقت اور سلیقہ انتظام کے، جو انسانی ہمدردی سرسیّد سے ظہور میں آئی اس کا جواب نہیں۔ سیّد احمد خان کو جو اس قدر عزت اور نیک نامی تمام ہندوستان میں حاصل ہوئی یہ اسی بھلائی اور نیکی کا ثمرہ ہے جو قحط کے انتظام میں ان سے ظاہر ہوئی۔

محتاج خانہ کے حسن انتظام کا یہ عالم تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ بھر میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کیلئے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھے۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں یا شیر خوار بچوں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کیلئے مسلمان اور ہندوؤں کیلئے ہندو کھانا پکاتے تھے۔ جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے، ان کے لئے علیحدہ چولہے بنے ہوئے تھے۔ شہر کی پردہ نشین عورتیں اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانہ میں نہیں آسکتی تھیں ان کے پاس سوت کاتنے کیلئے آٹھ آٹھ آنہ فی اسم اور ایک ایک پٹاری روئی کے گالوں کی میر محلوں کی معرفت بھیج دی جاتی۔ جب سوت کت کر آجاتا تھا تو اور روئی اور سوت کاتنے کی اجرت بھیج دیتے تھے۔ اس زمانے کی عورتیں جو اب تک جیتی ہیں، وہ سیّد احمد خان کو اب تک دعائیں دیتی ہیں۔

سرسیّد صبح شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت اور حالت آنکھ سے دیکھی نہ جاسکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے تھے، اور کپڑے بول و براز میں لتھڑے ہوئے ہوتے تھے، انکو سرسیّد خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے جا کر لٹا دیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے،

سر منڈواتے تھے، ہاتھ منہ دھلواتے تھے، دوا پلواتے تھے۔ اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔

حالی نے ''حیات جاوید'' میں اس قحط کے انتظام کے سلسلے میں سرسیّد کے ایک ممتاز ہم عصر جے کشن داس سی ایس آئی کو جو بعد کو سرسیّد کے گہرے دوست بن گئے تھے، ایک بیان میں نقل کیا ہے:

''جب سرسیّد نے رسالہ ''لائل محمڈنز آف انڈیا'' نکالنا شروع کیا تو اس کے بعض فقروں سے مجھے خیال ہوا کہ سیّد احمد خان نہایت متعصب آدمی ہیں۔ اور ہندوؤں سے ان کو کچھ ہمدردی نہیں ہے۔ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ اسی طرح ایک رسالہ ہندو خیر خواہوں کے تذکرہ میں نکالا جائے۔ وہاں سرسیّد سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے فقروں کا ذکر کیا جن سے ان کے تعصب کا خیال پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے معذرت کی اور اپنے قلم کی لغزش کا اقرار کیا۔ خیر یہ تو ایک اخلاقی جواب تھا۔ مگر جس شفقت اور ہمدردی سے وہ اس وقت ہر مذہب اور ہر قوم کے محتاجوں کے ساتھ پیش آ رہے تھے اس کو دیکھ کر میرا دل بالکل صاف ہو گیا۔ اور مجھے حیرت ہوئی کہ یہ شخص کیسی پاک طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ان کے ساتھ میری محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ اور اب جو کچھ میرا اور ان کا معاملہ ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔''

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا۔ مگر جو بھلے مانس علانیہ محتاج خانہ میں آنے سے شرماتے تھے ان کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آ کر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کیلئے ہر ایک جنس عمدہ اول درجہ کی منگوائی جاتی تھی۔ کھانے کے سوا ان کیلئے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اجلے انتظام کے جس قدر کم روپیہ ضلع مراد آباد میں خرچ ہوا ایسا کسی ضلع میں نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی عورت اور مرد محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے سب سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور رسیاں بٹتے تھے۔ سوت کاتتے تھے۔ سڑکوں پر کام کرتے تھے۔ اور طرح طرح کے کام جو ان سے ہو سکتے تھے، کرتے تھے۔ اور اس طرح انکے کام کی اجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف ہوتی تھی۔

محتاج خانہ کے علاوہ خود سرسیّد اپنی ذات سے اور نیز ان کی نیک بی بی جو ان سے بھی زیادہ خدا ترس تھیں، غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتی تھیں۔ ان کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن اور روٹیاں محتاجوں میں تقسیم ہوتی تھیں۔

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۱۰۳۔۱۰۵)

ایک موڑ، ایک تاریخ ساز فیصلہ

ایک موقع پر ۱۸۵۷ء کے حالات وواقعات سے سرسیّد سخت افسردہ اور دل برداشتہ ہو گئے تھے۔

حالی: سنا ہے کہ کبھی آپ نے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ بھی کیا تھا؟

سرسیّد: ۱۸۵۷ء کے واقعات نے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچایا۔ افسردگی اور مایوسی چھائی کہ میرا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا تھا۔

حالی: پھر آپ نے خود ساختہ جلاوطنی کا خیال کیسے ترک کیا؟

سرسیّد: اس وقت مذہب سے میں نے سوال کیا۔

حالی: کیا؟

سرسیّد: یہ کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیرخواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے مجھے بتایا کہ بانی اسلام جن کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جن کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ:

''لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ''

انہوں نے دنیا میں آ کر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیرخواہی میں بسر کی۔ وہ گمراہ تھے۔ ان کو ہدایت کی۔ وہ وحشی تھے۔ ان کو انسان بنایا۔ وہ دشمن تھے۔ ان میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی۔ وہ خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا۔ ان کا دین اور دنیا، دونوں درست کئے۔ ان کی خیرخواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں۔ ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا کہ

''حب الوطن من الایمان''

قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت پر منحصر ٹھہرایا اور کہا کہ ''سیّد القوم خادمھم''

اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور ''امتی امتی'' کہتا دنیا سے رخصت ہوا۔

حالی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کئے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔

انہوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیرخواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا، قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قویٰ نفسِ واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیرخواہی کیلئے وقف کر دیے۔

انہوں نے مذہب سے پوچھا قوم کی اصلی اور حقیقی خیرخواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعہ سے دین کو تقویت دینا مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں۔ اور گرتے چلے جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں کی ذلت عین اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز ان کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا۔ اور اسلام اس ملک سے رخصت ہو جائے گا۔ اسلئے انہوں نے اول دنیا ہی کی طرف دعوت دی۔ جو ذریعے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے، ان کیلئے مہیا کئے۔ سب سے زیادہ ان کی ترقی کا دارومدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ اس لئے گو ایک زمانہ نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی مگر انہوں نے جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے، اپنی پرزور تحریروں سے ان کی غلطی ثابت کی۔ سوشل اور اخلاقی برائیاں جو قوم میں شائع تھیں اور جو دنیوی عزت و وقار کے منافی تھیں، ان کی اصلاح کی۔

مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے، اور اس لئے وہ روز بروز معتبر ہوتے جاتے ہیں، جہاں تک ممکن تھا ان میں اتفاق کی بنیاد ڈالی۔ مدرستہ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدات کی۔ اپنے سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائے عمر میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اس سے ہمیشہ اجتناب کیا۔

باوجودیکہ ان کو اپنا مقصد پورا کرنے کیلئے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور اہل اسلام کے خلاف لکھنا پڑیں۔ مگر بغیر سخت ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی۔ کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا۔ کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کے نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اسلئے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزع بڑھنے نہ پائے۔''

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۳۰۷)

انگریز عورتوں اور بچوں کی
جان بچانے کے عوض جاگیر لینے سے صاف انکار

جنوری ۱۸۵۷ء سے سرسیّد بجنور میں صدر امینی فائز تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت رونما ہوئی۔ سرسیّد نے اس ہنگامے کے دوران اپنی جان پر کھیل کر کچھ انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھا۔ ایسا کرنا کسی ذاتی غرض کیلئے نہیں، خالصتاً انسانی ہمدردی کی بناء پر تھا۔ جب کہ انگریزی تسلط بحال ہوا تو سخت دارو گیر سزا اور جزا کا سلسلہ شروع ہوا۔

میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے۔ ان کا تعلقہ اس جرم میں کہ ان کی عرضی بادشاہ دلی کے دفتر سے برآمد ہوئی تھی، سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔

حاکم ضلع شیکسپیئر نے سرسیّد احمد خان کو بلایا

مسٹر شیکسپیئر: جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ خیرخواہان سرکاری کو باغیوں کی ضبط شدہ جائیدادیں دی جا رہی ہیں۔ گورنمنٹ کو رپورٹ کر رہا ہوں کہ بعوض خدمات ایام غدر آپ کو منجملہ تعلقہ چاند پور کے ایک معقول جاگیر نذر کی جائے۔

سرسیّد: میں اس خیال سے قطعاً متفق نہیں ہوں۔

مسٹر شیکسپیئر: کیوں؟ یہ آپ کا حق ہے۔ سرکار سب خیرخواہوں کو نواز رہی ہے۔

سرسیّد: یہ جاگیر قبول کرنے کیلئے میں ہرگز تیار نہیں ہوں۔ بدوں دو اسباب کے۔ پہلے تو یہ کہ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیرخواہی اور وفاداری جو مجھ سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ بڑا انعام اپنی خدمت کا میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس نازک وقت میں مجھ سے کوئی امر اخلاق و شرافت اور اسلام کی ہدایات کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔

شیکسپیئر: اس قاعدہ کے موافق کہ کسی کو اس کی نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن نہیں مل سکتی، آپ کی نقد پنشن بہت قلیل ہوگی۔

سرسیّد: جو کچھ سرکار عنایت کرے اس کا احسان ہے۔ مگر مجھ کو یہ جاگیر لینی ہرگز منظور نہیں۔

اس واقعہ کو اس تحریر میں جو نواب محسن الملک کی طرف سے مولانا نذیر احمد نے حیدرآباد میں لکھی تھی، اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''سیّد احمد خان کو حُسنِ خدمتِ غدر کے صلہ میں ضلع بجنور کے ایک بڑے مسلمان رئیس باغی کا بڑا بھاری علاقہ سرکاری نے دینا تجویز کیا تھا۔ مگر سیّد احمد خان نے صرف اسی وجہ سے اس کے لینے سے انکار کیا کہ ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس بجھانی ان کو کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتی تھی۔''

خود سرسیّد نے بھی اپنے ایک لیکچر میں جو ۲۸ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں مدرستہ العلوم کے تاریخی حالات پر دیا تھا، اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

''غدر میں جو حال انگریزوں اور انکے بچوں اور عورتوں پر گزرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔ اور ہندوستانیوں کے ہاتھ جو کچھ انگریزوں پر گزرا اس کا رنج تھا۔ جب ہمارے دوست نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے۔ بعوض اس وفاداری کے، تعلقہ جہان آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپیہ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائیداد لے کے تعلقہ دار بنوں۔ میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے۔ اور درحقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہیں سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔ اور جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اسی خیال میں اور غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا ور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مرادآباد میں آیا جو ایک بڑا غمکدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا، اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشہ عافیت میں بیٹھوں۔ نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔''

مرادآباد کی تبدیلی

اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور سے صدرالصدوری کے عہدہ پر ترقی پا کر مرادآباد گئے۔ اور ۱۸۵۹ء میں وہیں جب کہ باغیوں کی جائیداد مضبطہ کے متعلق عذرداریاں ہونے لگیں اوران کی سماعت اور تحقیقات کیلئے ایک سپیشل کمیشن بیٹھا، اس میں دو یورپین ممبر ایک کشمیری، روہیل کھنڈ، دوسرے جج مرادآبادی اورایک ہندوستانی ممبر یعنی سرسیّد مقرر ہوئے۔ چنانچہ دو برس تک وہ اپنے عہدہ کے علاوہ یہ کام بھی انجام دیتے رہے۔

جیسا میں دیوانہ ہوں، ویسا ہی وہ دیوانہ ہے

سرسیّد جیسے خود کھرے راستباز تھے، راستبازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ میرٹھ کے غلام نبی خان رہتک میں نائب سررشتہ دار کلکٹری مقرر ہوئے تھے۔ سرسیّد اس زمانہ میں وہاں صدرامین کے منصب پر فائز تھے۔ شروع شروع میں ایک بار ایک غلط فہمی میں انہوں نے سرسیّد کی امامت میں نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ جب غلط فہمی دور ہوئی تو برضا و رغبت سرسیّد کے پیچھے نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ سرسیّد کو ان کا کھرا پن بہت پسند آیا۔ اور وہ انکا بہت خیال رکھنے لگے۔ انہی دنوں غلام نبی کسمپرسی کی حالت میں بیمار ہوئے۔ سرسیّد تمام رات ان کی تیمارداری میں لگے رہے۔ حکیم اور ڈاکٹر خود ہی بلوایا اور دوائیں منگوائیں۔ صبح سویرے جب کی طبعیت سنبھلی تو سرسیّد فجر کی نماز پڑھ کر اپنے گھر گئے۔ تمام رات انہوں نے آنکھوں میں گزار دی تھی۔

غلام نبی خان کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کی خبر دلی میں سرسیّد کے دوست مولوی امام بخش صہبائی تک پہنچی۔

صہبائی: آپ نے غلام نبی میں کیا بات دیکھی جوان پر اتنے مہربان ہیں؟

سرسیّد: کچھ نہیں صرف اتنی سی بات ہے کہ جیسا میں سڑا (دیوانہ) ہوں ویسا ہی وہ سڑا (دیوانہ) ہے۔

انسان دوستی اور حسن انتظام و انصرام کی ایک نادر مثال

انتظام قحط ضلع مرادآباد

جہاں سرسیّد کی انسان دوستی اور بے تعصبی بے مثال تھی وہاں ان کی انتظامی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ ان کی بے نظیر کامیابیوں میں ان کے خلوص، تخلیقی سوچ کے علاوہ ان کے Management Skill کا بھی خاصا دخل تھا۔ انہیں آج کل کی اصطلاح میں Management Wizard کہا جا سکتا ہے۔ ان کی انسان دوستی، دل سوزی، بے تعصبی اور انتظامی قابلیت کا بھرپور اظہار انتظام قحط ضلع مرادآباد کے سلسلہ میں ہوا۔ ان کی انتظامی قابلیت کا معجزہ اسی حوالے سے سامنے آیا۔

اس کا آنکھوں دیکھا حال حالی نے سرسیّد کے مرادآبادی دوست محمد سعید خان کے حوالے سے لکھا ہے:

حالی: قحط کے دنوں میں آپ وہاں موجود تھے؟

محمد سعید خان: جی ہاں میں بسلسلہ ملازمت وہاں موجود تھا۔ ۱۸۶۰ء میں جبکہ اضلاع شمال ومغرب میں ایک عام قحط پڑا تھا اس وقت سرسیّد مرادآباد میں صدر الصدور تھے۔ مسٹر جان سٹریچی نے جو ان دنوں وہاں کلکٹر تھے اپنے ضلع کے قحط کا انتظام ان کے سپرد کر دیا تھا۔ اس موقع پر قطع نظر اس لیاقت اور سلیقہ انتظام کے، جو انسانی ہمدردی سرسیّد سے ظہور میں آئی، اس کا ثمرہ تھا کہ بعد میں انہیں اتنی عزت اور نیک نامی حاصل ہوئی۔

محتاج خانے کے حسن انتظام کا یہ حال تھا کہ چودہ ہزار محتاجوں کو گھنٹہ میں کھانا تقسیم ہو جاتا تھا۔ بیماروں کیلئے شفاخانہ اور ڈاکٹر موجود تھا۔ بیماروں کو پرہیزی کھانا ملتا تھا۔ زچاؤں او رشیر خواروں کو دودھ یا کھیر ملتی تھی۔ مسلمانوں کیلئے مسلمان اور ہندوؤں کیلئے ہندو کھانا پکاتے تھے جو ہندو اپنے سوا کسی کے ہاتھ کا پکا ہوا نہیں کھاتے تھے، ان کے لئے علیحدہ چولھے بنے ہوئے تھے۔ شہری پردہ نشین اور عزت دار عورتیں جو محتاج خانے میں نہیں آ سکتی تھیں انکے پاس سوت کاتنے کیلئے آٹھ آٹھ آنے فی اسم اور ایک ایک پٹاری روئی کے گالوں کی میر محلوں کی معرفت بھیج دی جاتی تھی۔ جب سوت کت کر آ جاتا تھا تو روئی اور کاتنے کی اجرت بھیج دیتے تھے۔

سرسیّد صبح و شام دونوں وقت بلاناغہ محتاج خانہ میں خود جاتے تھے۔ ایک ایک بیمار کو دیکھتے تھے۔ جن کنگلوں کی صورت و حالت آنکھ سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی، جن کے دست جاری ہوتے

تھے اور کپڑے بول براز میں لتھڑے ہوتے تھے، ان کو سرسیّد خود اپنی گود میں اٹھا کر دوسری صاف جگہ احتیاط سے لیجا کر لٹا دیتے تھے۔ ان کے کپڑے بدلواتے تھے، سر منڈواتے تھے، ہاتھ دھلواتے تھے، دوا پلواتے تھے۔ اور نہایت شفقت سے ان کے ساتھ پیش آتے تھے۔

حالی: ان محتاجوں میں ہندو مسلمان سب ہوتے تھے؟

محمد سعید خان: بالکل ہوتے تھے۔ ہندو ہو کہ مسلمان، سرسیّد ان کی دیکھ بھال یا ہمدردی میں قطعاً کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

محتاج خانہ میں شام کا کھانا سب محتاجوں کو دن چھپنے سے پہلے بٹ جاتا تھا۔ مگر جو بھلے مانس اعلانیہ محتاج خانے میں آنے سے شرماتے تھے ان کو عام اجازت تھی کہ رات کو اندھیرے میں آ کر کھانا کھا جایا کریں۔ محتاجوں کے کھانے کے لئے ہر ایک چیز عمدہ اول درجے کی منگوائی جاتی تھی۔ کھانے کے علاوہ ان کیلئے ضروری کپڑا بھی تیار کرایا جاتا تھا۔

باوجود ایسے اجلے انتظام کے، جس قدر روپیہ ضلع مرادآباد میں خرچ ہوا، اتنا کسی اور ضلع میں نہیں ہوا۔ سبب یہ تھا کہ جتنے آدمی، عورت اور مرد، محتاج خانہ میں کام کے لائق تھے، ان سے کام لیا جاتا تھا۔ بان اور رسیاں بٹتے تھے، سڑکوں پر کام کرتے تھے۔ عورتیں سوت کاتتی تھیں۔ اور طرح طرح کے کام جو مرد اور عورت کر سکتے تھے، کرتے تھے۔ اس طرح ان کے کام کی اجرت سے ہر روز ایک رقم کثیر جمع ہو جاتی تھی جو محتاج خانہ میں صرف کی جاتی تھی۔

حالی: محتاج خانہ کے انتظام و انصرام کے موقع پر سرسیّد خود بھی کچھ کرتے تھے؟

محمد سعید خان: کچھ نہیں، بہت کچھ۔ سرسیّد اپنی ذات سے نیز ان کی نیک بی بی جو ان سے بھی زیادہ خداترس تھیں، دونوں غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری کرتے تھے، ان کے مکان پر ہر روز ایک دیگ سالن کی اور روٹیاں محتاجوں کو تقسیم ہوتی تھیں۔

قحط زدہ لاوارث بچے

حالی: مشہور تھا کہ ۱۸۶۰ء کے تمام قحط کے زمانہ میں سرسیّد نے ضلع مرادآباد کے قحط زدہ مسلمان اور ہندو بچوں کو مشنریوں کے حوالے کرنے سے گریز کیا، آپ مرادآباد میں سرسیّد کے ہم عصر تھے۔ قحط زدہ مسلمان اور ہندو بچوں کے ساتھ سرسیّد نے کیا سلوک کیا؟

محمد سعید خان: اس زمانے میں، میں ضلع کچہری ہی میں ملازم تھا۔ خوب یاد ہے کہ سرسیّد کو جب ضلع کے کلکٹر سٹریچی صاحب نے قحط کا انتظام سپرد کیا تھا تو سرسیّد نے صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس شرط پر انتظام کرتا ہوں کہ جتنے لاوارث بچے آئیں گے ان میں جتنے مسلمان ہوں گے۔ وہ مسلمانوں کے اور جتنے ہندو ہوں گے، وہ ہندوؤں کے سپرد کئے جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے لاوارث بچے آئے وہ ہندوؤں، مسلمانوں کے سوا کسی مشنری کو نہیں لینے دیئے۔ مگر حسبِ ہدایت سٹریچی صاحب کے جو بچہ جس کے سپرد کرتے تھے اس سے

ایک اقرار نامہ لکھوا لیتے تھے کہ ہم اس کو لونڈی یا غلام نہیں بنانے کے۔ ہوشیار ہونے کے بعد جہاں اس کا جی چاہے رہے۔ اور جہاں چاہے چلا جائے۔

لیکن ہنوز قحط کا انتظام ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ جان سٹریچی مرادآباد سے بدل گئے۔ اور مسٹر پاور ان کی جگہ آئے۔ مشنریوں نے سٹریچی صاحب کے سامنے تو دم نہیں مارا مگر ان کے جاتے ہی مسٹر پاور سے سرسیّد کی شکایت کی۔ اور یہ چاہا کہ تمام لاوارث بچے جو ہندو، مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں وہ واپس لئے جائیں۔ اس زمانہ میں مسٹر الگزینڈر شیکسپیئر جو سرسیّد کے نہایت دوست تھے، مرادآباد میں جج تھے۔ انہوں نے سرسیّد کو ہر چند سمجھایا کہ جتنے لڑکے اور لڑکیاں خاص تمہارے سپرد کی گئی ہیں وہ تم سے نہیں لی جائیں گی۔ مگر اور لوگوں پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ مگر سرسیّد نے ہرگز نہ مانا اور یہ کہا کہ:

"میں نے اسی شرط پر قحط کا انتظام اپنے ذمے لیا تھا کہ لاوارث بچے مشنریوں کو نہیں دیئے جائیں گے۔ اور سٹریچی صاحب گورنمنٹ کو رپورٹ کر چکے ہیں کہ لاوارث بچوں کا اس طرح بندوبست کیا گیا ہے۔ پس اس کے خلاف کیونکر ہوسکتا ہے۔ مجھے جس طرح گوارہ نہیں کہ ایک سیّد کا بچہ مشنریوں کو دیا جائے اسی طرح یہ گوارہ نہیں کہ ایک چمار کا بچہ ان کو دیا جائے۔"

مسٹر پاور کو جب سرسیّد کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اس معاملہ پر غور کرنے کیلئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ چونکہ اس زمانے میں ہندوستانی حد سے زیادہ ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔ اور انگریزوں کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا، سرسیّد اور ایک دو اور ممبروں کے سوا تمام کمیٹی کا اتفاق ہو گیا کہ جتنے بچے ہندوؤں، مسلمانوں کے سپرد کئے گئے ہیں وہ واپس لئے جائیں۔ کیونکہ ان پر اعتماد نہیں کہ وہ ان کو لونڈی غلام نہ بنائیں گے۔ آخر کار کمیٹی کی یہ رپورٹ منظور ہو گئی۔ اور تمام لاوارث بچے ہندوؤں، مسلمانوں سے واپس لے کر مشنریوں کو دلوا دیئے گئے۔ سرسیّد کے ہاں بھی پانچ چار لڑکے اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اور ان کی بی بی ان کو کمال شفقت سے رکھتی تھیں۔ سرسیّد نے پہلے اس کے کہ کوئی ان سے مانگنے آئے، فوراً ان کو کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جاتے ہوئے وہ بچے زاروقطار روتے تھے اور ہرگز جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر مجبوراً ان کو بھیجنا پڑا۔

سرسیّد کہتے تھے کہ اس وقت میرا مصمم ارادہ ہو گیا تھا کہ جب کبھی موقع ملے تمام ہندوؤں مسلمانوں سے چندہ کر کے کسی صدر مقام پر ایک بہت بڑا یتیم خانہ قائم کیا جائے جہاں ہندوستان کے لاوارث بچوں کی پرورش ہو۔ اور ان کو تعلیم دی جائے۔ لیکن آخر کار یقین ہو گیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہو گی، ان خرابیوں کا کلی انسداد کسی طرح نہیں ہوسکتا۔

(حیات جاوید۔ حالی۔ صفحہ ۱۱۰)

باب سوم

لندن میں قیام

(خبر و نظر میں یکتا)

سر سیّد کے سفرنامہ
''مسافران لندن''
سے
چند اقتباسات

لندن میں قیام

لندن کا سفر نامہ ''مسافران لندن''

سرسیّد یکم اپریل ۱۸۶۹ء کی صبح بنارس (جہاں وہ بحیثیت جج عدالت خصوصی) اپنے بڑے بیٹے سیّد حامد، چھوٹے بیٹے سیّد محمود (ایک پرسنل سیکرٹری) مرزا خدا داد بیگ اور ایک گھریلو خاندانی ملازم چھجو کے ہمراہ براستہ جبل پور اور بمبئی، لندن روانہ ہوئے۔ اور ۵ اکتوبر ۱۸۷۰ء کی صبح بنارس واپس آ کر اپنے فرائض منصبی کی ٹوٹی ہوئی ڈور جوڑی۔ سال ڈیڑھ سال کا یہ عرصہ سرسیّد کی زندگی میں (بالواسطہ طور پر قومی تاریخ میں) ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پچھلے آٹھ دس سال سے ان کی ذہن میں جو خیالات مبہم طور پر گردش کر رہے تھے ان کو اس سفر نے ایک واضح Vision اور ایک مربوط Strategic Planning کی صورت دی۔ یہی وہ زمانہ تھا (۱۸۶۸ء) جب انہوں نے اردو ہندی کے پس منظر میں دوٹوک الفاظ میں دو قومی نظریہ قوم کے سامنے رکھا۔ اور برصغیر میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کے تصور کو اجاگر (Highlight) کیا۔

نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ کا ایک قول نقل ہوا ہے کہ:

''وہ شخص جو بصیرت رکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے، اپنے دماغ سے بھی دیکھتا ہے، اور اپنے دل سے بھی دیکھتا ہے۔''

سرسیّد صاحب بصیرت انسان تھے جنہوں نے اپنے سفر لندن کے دوران مغربی تہذیب اور تمدن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے ذہن سے پرکھا اور اپنے دل میں محسوس کیا۔ اور وہ بہت واضح اور یقینی طور پر اپنے تجزیے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے کہ اقوام مغرب کی تہذیبی، تمدنی اور صنعتی ترقی کی جڑیں ان کی جدید علمی اور سائنسی ترقی میں پیوست ہیں۔ ان کی فراست نے مغرب کی تہذیب اور صنعتی مضبوطیوں ہی کو نہیں دیکھا، اس کی معاشرتی کمزوریوں کا بھی جائزہ لیا۔

ایک بڑے آدمی کی ہر بات بڑی ہوتی ہے۔ ایک Committed انسان ہر تجربے سے اپنے مطلب کی بات نکال لیتا ہے۔ سرسیّد تو سرسیّد تھے۔ ان کی تو ایک دھن تھی کہ ہر قدم سے، ہر کام سے قومی اصلاح کا کام لیا جائے۔ چنانچہ اس سفر کے شب و روز کو وہ قوم کے استفادے کیلئے ایک سفر نامے کی شکل میں قلمبند کرتے رہے۔

سرسیّد نے اپنے نانا خواجہ سیّد فریدالدین کی مختصر سوانح ''حیات فریدیہ'' میں مختصر طور پر اپنے خاندانی حالات لکھنے کے علاوہ اپنی سوانح حیات باقاعدہ طور پر اپنے قلم سے نہیں لکھی۔ لیکن ''سفر نامہ لندن'' کی یہ مختصر روداد (جو بعد میں ''سفر نامہ مسافران لندن'' کے نام شائع ہوئی) بشمول ان خطوط کے جو اس عرصے میں انہوں نے لندن سے اپنے قریبی رفقاً کار کو لکھے، جزوی طور پر سہی، بہت قیمتی سوانحی دستاویز ہے۔ ان کے قلم سے بے ساختہ نکلا یہ سفر نامہ ایک ایسا صحیفہ ہے جس میں ان کے بنیادی تصورات کو پڑھا اور دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے۔ ان کی شخصیت کی Core Values یعنی ذہن رسا، شفاف خلوص، قوم سے جنون کی حد تک محبت، اسلام اور رسول کریم ﷺ سے والہانہ شیفتگی، سارے سفر نامے میں جاری و ساری ہیں۔ یہ سفر نامہ ان کی قوت مشاہدہ، انتہائی جزئیات اور گہرائی میں جا کر تجزیہ کرنے کی صلاحیت اور قوت تحریر کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ورق ورق سے ایک ہی صدائے دردناک آ رہی ہے۔ ''قوم، قوم''۔ قوم ان کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ یہی حال، حالی، محسن الملک اور وقار الملک جیسے ان کے رفقاء کا تھا۔ اللہ اکبر! پاکستان کا خمیر کیسی کیسی برگزیدہ ہستیوں کے خون جگر سے اٹھا ہے۔

یہ سفر نامہ ۱۸۷۰-۷۱ء سے ''تہذیب الاخلاق'' رسالہ میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ بعد میں علیحدہ کتابی صورت میں بھی چھپا۔ حالی نے سرسیّد پر اپنی کلاسیکی سوانحی کتاب ''حیات جاوید'' ان کی زندگی ہی میں لکھنا شروع کی۔ اغلب ہے کہ انہوں نے سرسیّد سے سوانحی تفصیلات کیلئے انٹرویو بھی لیا ہوگا۔ انٹرویو میں سفر لندن کا بھی ذکر آیا ہوگا۔ (''حیات جاوید'' میں سفر نامے کو Extensivley Quote کیا گیا ہے)۔ اس Assumption کی بنا پر ان معلومات اور تاثرات کو جو سفر نامہ میں مکالمے (Dialogues) کی شکل میں نہیں بھی ہیں، انہیں کتاب کے مکالماتی Format کی وجہ سے حالی کے حوالے سے مکالماتی انداز میں نقل کیا گیا ہے۔ گو عبارت لفظ بلفظ سرسیّد کی اپنی ہے۔ (جس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔)

ایک سفر جس نے قوم کی زندگی بدل دی

حالی: قبلہ، میں سمجھتا ہوں کہ ۱۸۶۹ء میں آپ کا انگلستان کا سفر ایک تاریخ ساز سفر تھا، جس نے قوم کی تقدیر بدل دی۔ میں نے آپ کا سفر نامہ ''مسافران لندن'' بغور پڑھا ہے۔ میں آپ کے بعض مشاہدات اور تجربات کی تفصیل آپ کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔ تاکہ میں ''حیات جاوید'' کیلئے کچھ نیا مواد حاصل کرسکوں۔

سرسیّد: میں سفر نامے میں وہ سب کچھ کہہ چکا ہوں جو میرے نزدیک اہم تھا۔

حالی: ابھی حال ہی میں مولوی سیّد مہدی علی خان کی تحریر نظر سے گزری۔ اگر آپ اجازت دیں تو پیش کروں۔

سرسیّد: سنائیے۔

حالی: مولوی سیّد مہدی علی لکھتے ہیں:

''جب سرسیّد احمد خان لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کر سکتا۔ انہوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا۔ گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا۔ اور سفر کی تیاری کی۔ انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارے ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں بذات خود اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔''

سرسیّد: بھائی مہدی نے جو لکھا ہے بالکل صحیح ہے۔

حالی: میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ولایت جانے کا راستہ کیسے نکلا۔ زادِ راہ کی صورت کیسے ہوئی؟

سرسیّد: ولایت جانے کا قصد میں نے تین وجوہ سے کیا تھا۔ ایک بچوں (سیّد حامد اور سیّد محمود) کی تعلیم، دوسرے ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کی غلطیوں کا جواب لکھنے کیلئے ضروری مواد کا حصول، تیسرے انگلستان کے تعلیمی نظام کا بذات خود مطالعہ۔

حالی: اور زادراہ؟ اخراجات؟

سرسیّد: جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، مجھے ولایت کے سفر کی تحریک زیادہ تر اس سکالرشپ کے سہارے ہوئی تھی، جو سیّد محمود کی تعلیم کیلئے گورنمنٹ نے عنایت کیا تھا۔ علاوہ اس دس ہزار روپے کے، پچاس ہزار روپے مجھے خود خرچ کرنا پڑے۔

حالی: وہ کہاں سے آئے؟

سرسیّد: جائیداد، گھر کا ساز و سامان بیچا، کتابوں کی بولی لگائی، رخصت کے زمانہ کی تنخواہ کٹوائی اور جو کچھ جمع جتھا تھا وہ بھی داؤ پر لگایا۔

حالی: قبلہ! میں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں آپ کا سفر نامہ ''مسافران لندن'' پڑھا ہے۔ بہت دلچسپ ہے۔ میں کچھ واقعات آپ کی زبانی سننا چاہتا ہوں۔

سرسیّد: میرے لئے ہر وہ واقعہ دلچسپ ہوتا ہے جس سے قومی فلاح کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

حالی: جی۔

سرسیّد: بمبئی جاتے ہوئے براستہ جبل پور بلکام کے سٹیشن پر پہنچے تو ہم نے تین برہمنوں کو (جن میں سے ایک معزز معلوم ہوتا تھا اور پوشاک بھی معقول پہنے ہوئے تھا، دیکھا کہ لوگوں کو نہایت تمیز و صفائی سے پانی پلا رہے ہیں اور پانی بھی نہایت عمدہ، صاف، میٹھا، بہت ٹھنڈا پانی ہے۔ وہ معزز برہمن پکارتا ہے کہ

ریل والو! بہت ٹھنڈا پانی ہے۔

پینے والو! پانی پیو، بہت ٹھنڈا پانی ہے۔

برتن بھی ان برہمنوں کے جن سے وہ پانی دیتے تھے نہایت اچھے اور صاف، خوبصورت تھے۔ اگرچہ شاید یہ انتظام بالتخصیص ہندوؤں کے آرام کے واسطے ہو۔ مگر وہ سب کو پانی دیتے تھے۔ اور تمام مسافروں کو نہایت آرام تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہم متعجب ہوئے۔ جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جیون رام جادوا سیٹھ، ساکن کامپٹی اس سٹیشن پر دھرم کیلئے پو (سبیل) بٹھائی ہے اور پانی پلانے کا بندوبست کیا ہے۔ تاکہ مسافروں کو اور بالتخصیص ہندوؤں کو تکلیف نہ ہو۔ اور اسی سبب سے ایسا عمدہ سامان اور ایسا اچھا ٹھنڈا پانی ہے۔ یہ بات مجھے نہایت پسند آئی اور دل میں بیٹھ گئی۔ اور جب زیادہ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہر سٹیشن پر جو کسی قصبہ یا شہر کے متصل ہے، کسی خاص مہاجن نے ورنہ اس شہر یا قصبہ کے دکان داروں نے آپس میں چندہ کر کے پو بٹھا رکھی ہے۔ اور پانی پلانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ چنانچہ ہر ایک سٹیشن پر ہم کو چندے کی بٹھائی ہوئی پو ملی، ویسی خوبی اور خوش اسلوبی اور پانی کی احتیاط دوسری جگہ نہ تھی۔ اس وقت اپنے ملک پر افسوس آیا۔ کیا ہمارے غریب شہر علی گڑھ وغیرہ کے لوگ ایسے نہیں ہیں جو اپنے اپنے شہروں کے سٹیشنوں پر ایسا عمدہ بندوبست کریں؟ اور کیا آگرہ کے متمول ٹونڈلہ کے سٹیشن پر اور بنارس کے دولتمند مغل سرائے کے سٹیشن پر ایسا بندوبست نہیں کر سکتے؟ افسوس ہے کہ وہ لوگ صرف اپنا برف کا پانی پی لینا دنیا کی تمام نعمت سمجھتے ہیں۔ زندگی اور مال و دولت اپنے آرام کو نہیں ہے۔ بلکہ اوروں کو آرام پہنچانے کیلئے ہے۔

دانائی کی قیمت

لندن جاتے ہوئے جبل پور سے سرسیّد بمبئی ریلوے کمپنی کی ایک ریل میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں ایک سٹیشن پر دلچسپ واقعہ پیش آیا۔

حالی: جسے آپ نے دانائی کی قیمت کہا ہے، وہ کیا واقعہ تھا؟

سرسیّد: بمبئی کے راستہ میں ایک سٹیشن سے مجھے تار میں خبر بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔ میں نے پرچہ پیام انگریزی میں لکھا ہوا تار گھر میں دیا اور ایک ناگر نے، جو خبر بھیجتا تھا، لے لیا اور حساب کر کے تین روپے طلب کئے جو درحقیقت صحیح محصول اس کا تھا۔ چنانچہ میں نے تین روپے دے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ناگر میرے پاس آیا اور کہا کہ اگر میں تمارا ایک روپے کا فائدہ کر دوں تو آٹھ آنے مجھے دے دو گے؟ میں نے کہا کہ کیوں کر؟ اس نے کہا کہ دو لفظ اس خبر میں بلانقصان مضمون کم ہو سکتے ہیں اور ان کی کمی سے صرف دو روپے محصول رہ جائے گا، اس میں کمپنی کی کچھ چوری نہیں۔ میں نے اپنی عقل سے تمہارا ایک روپیہ بچایا، اس کی عوض

میں آٹھ آنے چاہوں گا۔

''نصف لی و نصف لکم''

اس کی اس بات نے مجھے عجب مزا دیا اور میں نے دو لفظ کاٹ دیئے۔ روپیہ پھیر لیا۔ اور آٹھ آنے اس کی دانائی اور اپنی حماقت کی نذر کیے۔

بھنڈی بازار کی مسجد میں نماز

حالی: قبلہ، لندن جانے سے پہلے جو چند روز بمبئی میں آپ کا قیام رہا۔ اس عرصہ میں آپ کی کوئی قابل ذکر مصروفیات؟

سرسیّد: سفر کی تیاری کے علاوہ جو چند دلچسپ مصروفیات رہیں، بھنڈی بازار گھومنے گئے تھے۔ ہم ایک کتب فروش کی دکان پر بھی گئے تھے، وہیں دلی کے ایک بزرگ میر اشرف علی سے ملاقات ہوئی۔ ان حضرت نے میری کتاب ''آثار الصنادید'' بھی پڑھ رکھی تھی۔ اس دکان کے قریب ایک مسجد ہے جو نواب کی مسجد کہلاتی ہے، اس میں مغرب کی نماز کی اذان ہوئی۔ ہم لوگ نماز کو اٹھے اور محمود بھی نماز کیلئے ہمارے ساتھ ہوا۔ چلتے وقت مجھ کو خیال ہوا کہ ہماری قطع اور وضع لباس دیکھ کر ضرور لوگ متعجب ہوں گے۔ مگر وہاں دیکھا کہ بہت سے آدمی ہماری سی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اتنا تو لوگوں نے دیکھا کہ کوئی شخص نماز کو آیا مگر اس کے سوا اور کچھ خیال بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوا کہ اکثر ترک ان مسجدوں میں نماز کو آ جاتے ہیں اور ان کی وضع اور لباس ہمارا سا ہوتا ہے اس لئے کسی کو کچھ تعجب نہیں ہوا۔

حالی: بمبئی کے مسلمانوں کو آپ نے کیسا دیکھا؟

سرسیّد: ان دنوں مسلمانوں کی حالت بشمول میمن بھائیوں کے، ناگفتہ بہ تھی۔ تعلیمی ادارے بہت پسماندہ اور آپس میں شدید ناچاقی۔ اس شہر میں غالباً تمام ملکوں کے لوگ موجود ہوں گے مگر میمن اور پارسی یہاں کے بڑے امیر آدمی ہیں اور سوداگروں میں سیٹھ کا لقب نہایت معتبر و معزز گنا جاتا ہے۔ بڑے بڑے پارسی بھی اپنے نام کے ساتھ سیٹھ کا لقب لگاتے ہیں۔ مثلاً سہراب جی کریم جی سیٹھ۔

میمنوں نے بجز اس کے کہ اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور عربی عمامے باندھتے ہیں اور بگھیوں میں چڑھتے ہیں اور اپنے نام اور اپنی شیخی کے پیچھے مرتے ہیں۔ اور کچھ قومی ترقی نہیں کی۔ مسجد بنانے کا بڑا شوق ہے۔ بہت سے میمن ہیں جن کے ہاں تھوڑا تھوڑا لنگر خانہ جاری ہے، ان کی نام آوری کیلئے برائے نام ایک مدرسہ ہے۔ ایک ملا اس میں پڑھانے کو نوکر ہے، پر

نابالغ برائے نام طالب علم لنگر خانہ سے روٹی پاتے ہیں، دن کو ایک آدھ برائے نام سبق پڑھا، پھر کسی میمن کے لڑکے کو پڑھانے چلے گئے، کوئی شخص کسی اور طرح سے خیرات مانگنے کا پیشہ کرنے چلا گیا۔ مجھ کو یہ حال دریافت ہونے سے نہایت افسوس ہوا اور میں نے کہا، دیکھو، قوم کا جوادبار ہے تو باوجودے کہ روپیہ خرچ ہوتا ہے مگر کس بری طرح خرچ ہوتا ہے۔ جس سے نہ دین کا فائدہ نہ دنیا کا، البتہ صرف چند روزہ ایک نام ہے کہ فلاں میمن کا مدرسہ ہے۔ علاوہ اس کے دو کٹ ملا خوشامدیوں نے تعریف کر دی اور کہا کہ آپ نے تو جنت میں ایک موتی کا محل بنالیا "لعنة الله علی الکاذبین" وہ لوگ مر گئے جو موتی کا گھر بناتے تھے، ایسی باتوں سے تو چھوٹی کھپریل کا گھر بھی نہیں بنتا۔

پارسیوں نے البتہ قومی ترقی خوب کی ہے۔ اپنے لباس کی وضع عمدہ طور پر تراش کر درست کر لی ہے۔ تمام پارسی، کیا بڑا اور کیا چھوٹا، سب ایک وضع کی پوشاک پہنتے ہیں۔ نہانا اور پوشاک بدلنا اور صفائی سے رہنا بالکل اختیار کیا ہے۔ اولوالعزمی بھی ان میں ہے۔ تجارت اور نوکری کو دور دور جاتے ہیں۔ اور شائستگی اور تربیت میں روز بروز ترقی کرتے ہیں۔ لڑکیوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہیں۔ اور چوں کہ ان کے ہاں پردہ نہیں ہے اس لئے معتبر اور لائق طمانیت سکول بنائے ہیں۔ اور ان میں لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ ہر پارسی انگریزی پڑھا ہوا ہے۔ اور بایں ہمہ اپنے مذہب کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اور نہایت پابند اپنے اصول مذہب کے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بعض پارسی اپنی لڑکیوں کو انگریزی بھی پڑھاتے ہیں۔ کوئی سکول ہے۔ وہاں اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس برس کی عمر کی لڑکیاں انگریزی پڑھنے کو جمع ہوتی ہیں اور بخوبی پڑھ گئی ہیں، انگریزی بولتی ہیں اور چھٹی لکھتی ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اپنی زبان چھوڑ کر پارسیوں کو لڑکیوں کے انگریزی پڑھانے لکھانے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے۔

(سفرنامہ، صفحہ ۵۲)

غرض کہ بمبئی میں مجھ کو پارسی بہت پسند آئے۔ انہوں نے نہایت عمدہ طرح سے قومی ترقی شروع کی ہے۔ اور جس طرز پر کہ بنگالیوں نے قومی ترقی شروع کی ہے، میری دانست میں پارسیوں کا طرز اس سے نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان ہر جگہ سب سے پیچھے ہیں۔

"وتعز من تشاء و تذل من تشاء"

حالی: بمبئی سے کب آپ عازم لندن ہوئے؟

سرسیّد: قریب چھ بجے شام کو دسویں اپریل ۱۸۶۹ء کو ہمارے بڑودہ نے لنگر اٹھایا اور ہم نے نہایت

صدق دل سے آیت:

''بسم اللہ مجرٖھا و مرسٰھا ان ربی لغفور الرحیم''

پڑھی اور روانہ ہوئے۔

ایک سماجی شخصیت اور ایک مذہبی شخصیت سے ملاقات

سرسیّد کا یہ سفر نامہ ان کی قدروں (Values) اور ترجیحات کا آئینہ دار ہے۔ دوران سفر وہ جن شخصیات سے ملے، جن مقامات کو دیکھا اور جس نظر سے دیکھا۔ اس کا بیان ان کے ذہن اور دل، دونوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ سرسیّد کی نفسیاتی سوانح حیات ان اوراق سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ داستان ان کے اپنے حکم سے لکھی گئی ہے اس لئے اس کی سچائی میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔

سرسیّد سماجی کارکنوں، کارخیر سے منسلک لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اور ان سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ خواہ ان کا تعلق کسی ملک وقوم سے ہو۔ پس ہر دم یہی جذبہ ہوتا تھا کہ اپنے ملک وقوم کیلئے اپنے اور غیر کے تجربے سے کچھ سیکھیں۔

حالی: قبلہ! اس سفر کے دوران آپ کی ملاقات بے شمار لوگوں سے ہوئی ہوگی۔ ان میں سے چند کے بارے میں کچھ بتایئے، جن سے آپ متاثر ہوئے ہوں؟

سرسیّد: بے شمار اکابر سے نیاز حاصل ہوا۔ ان میں سے چند کا ذکر کرتا ہوں۔

''مجھ کو بڑودہ دخانی جہاز میں جب کہ میں لندن کو جاتا تھا، مس کارپینٹر صاحبہ سے ملاقات حاصل ہونے کی عزت اور بے انتہا مسرت حاصل ہوئی، جب سے میں ان کا نام اور ان کی کوششوں کا حال نسبت تعلیم ہندوستانی عورت کے سنا تھا، میں بہت مشاق ان کی ملاقات کا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بطور نعمت غیر مترقبہ ان سے ملاقات ہوگئی۔

ان کی عالی ہمتی اور بلند نظری اور تہذیب، اخلاق اور نیک نیتی کا ثبوت وہی مضمون ہے جو انہوں نے اختیار کیا ہے یعنی اس گروہ کی تعلیم و تربیت کوشش کرنا جس کو خدا تعالیٰ نے مرد کے لئے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لئے مرد کا مددگار کیا ہے) گروہ کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرنا۔ درحقیقت یہ مضمون اور اس پر ان کی کوشش نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نیک کام پر کوشش (گو کسی طرح پر ہو) نہایت اچھی ہے۔ کیونکہ اگر وہ کوشش درست بنیاد پر قائم ہوئی ہے تو وہ خود کامیاب ہوگی۔ اور اگر اس میں کچھ غلطی ہے تو اس سے امید ہے کہ اوروں کو اس نیک کام پر کوشش کرنے کی تحریک ہوگی جس سے توقع ہے کہ کوئی نہ کوئی کوشش بغیر کسی غلطی کے شروع ہوگی

اور ٹھیک ٹھیک نیک نتیجے تک پہنچے گی۔
نیک کام میں کوشش کرنے والوں کی کوششیں کبھی کبھی اس لئے کہ وہ ان لوگوں کی عادات اور رسم و رواج کے مخالف طریقے پر جن کی بھلائی کیلئے کوشش کی جاتی ہے، قائم کی گئی ہیں، برباد ہوگئی ہیں۔ حقیقت میں ایسا کرنا گویا نیچر کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور خود اس نیکی کی رکاوٹ کا آلہ کار بنتا ہے۔ خدا نے یوشع کیلئے سورج کا تھم جانا کہا حالانکہ شاید یہ غلط تھا۔ کیونکہ اگر وہ واقع بھی ہوا ہو تو شاید زمین کا تھم جانا سچ ہوتا۔ خدا نے نیک بات پھیلانے میں بالکل عام سمجھ کی جو اس زمانے میں تھی، رعایت کی۔ پس اگر اب ہم کسی نیک بات کے پھیلانے میں عام رواج کی رعایت نہ کریں گے تو خود خدا کی اس حکمت کو توڑیں گے۔ اور خود اپنے لئے نقصان کا سبب ہوں گے۔
بہرحال میں خدا سے چاہتا ہوں کہ مس کارپینٹر صاحبہ کی کوششیں کامیاب ہوں۔ اور ہندوستان میں کیا مرد اور کیا عورت، سچائی اور علم کی روشنی سے جو دونوں اصل میں ایک ہیں، روشن ضمیری حاصل کریں۔

مسٹر لارنس سے دلچسپ مذہبی گفتگو

سرسیّد: لیفٹیننٹ جے بی لارنس صاحب مدراس کے علاقہ کے جو پیمائش کے کام پر متعین ہیں، وہ بھی اس جہاز میں تھے۔ ایک رات کو وہ نہایت مہربانی سے میرے پاس آ کر بیٹھے اور پوچھا کہ ''تم لندن جاتے ہو؟'' میں نے کہا ''ہاں۔'' پھر کہنے لگے کہ ''میں مدراس سے آتا ہوں، میں مشنری نہیں ہوں میرا کام توپ مارنے کا ہے۔ میں نے مدراس کے علاقے میں جو لوگوں سے پوچھا تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں تین مذہب سچے ہیں۔ ہندو، عیسائی، مسلمان۔ کیا یہ بات تمہارے نزدیک بھی سچ ہے؟'' یہ سوال کر کے ہی خود ہی جواب دیا کہ ''میرے نزدیک تو صحیح نہیں کیونکہ صحیح مذہب صرف ایک ہی ہو گا۔'' میں نے کہا کہ ''ہاں، متعدد مذہب جو مختلف اصول پر مبنی ہوں سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ بلکہ سب مذہبوں میں صرف ایک ہی مذہب صحیح ہو گا یا مختلف اصولوں میں ایک ہی اصول مذہب صحیح ہوں گے۔'' اس پر بولے کہ ''میرے نزدیک عیسائی مذہب بالکل سچا و صحیح ہے۔'' میں نے کہا کہ ''ہر شخص اپنے مذہب کو ایسا ہی سمجھتا ہے۔'' کہنے لگے کہ ''اوروں کی سمجھ ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے کہا کہ ''آپ کے خیال کے صحیح ہونے اور اوروں کی سمجھ کے غلط ہونے کی کیا دلیل ہے؟'' کہنے لگے کہ ''دیکھو، عیسائی قوم نے کیا کچھ کیا ہے، انگریزوں نے تمام دنیا کی قوموں سے زیادہ خدا کی مہربانی حاصل کی ہے۔ علم و ہنر جیسا کہ ہمارے پاس ہے دوسری قوم کے پاس نہیں۔ ہم ہی کو خدا

نے حکمت عطا کی ہے۔ دیکھو اس دخانی جہاز کو کہ کیا حکمت سے بنا ہے اور کس حکمت سے چلتا ہے۔ ریل گاڑی کی حکمت اور طاقت تم نے بخوبی دیکھی ہوگی۔ تار برقی کی کرامت تم جانتے ہو۔ فوج کی اور جنگ کی بادشاہی قوت تمام دنیا میں ہماری سی کسی میں نہیں۔ اگر اور کوئی مذہب سچا ہوتا تو اس پر خُدا اسی طرح مہربان ہوتا'' میں نے کہا ''یہ سب باتیں دنیا کے کاموں سے متعلق ہیں، ان کا مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ دیکھو خدا تعالیٰ نے اپنے نیک بندے ایوب کو اور اپنے پیارے جیسس کرائسٹ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں ذرا بھی جگہ نہ دی۔ نیک بندوں کیلئے دنیا نہیں ہے بلکہ دوسری زندگی کی نعمت ہے۔''

یہ سن کر تھوڑی دیر چپ رہے۔ میں سمجھا کہ اب بات ختم ہوئی۔ اس لئے کہ میں آپس کی صحبت اور ملاقات میں مذہبی گفتگو کو نہایت ناپسند کرتا ہوں۔ بلکہ برخلاف اخلاق کے سمجھتا ہوں۔ مگر افسوس کہ ان کا ارادہ اس کے ختم کا نہ تھا۔ وہ بولے کہ ''میں تم سے ایک بات جو نہایت سچ ہے اور دینی کام کی ہے اور جس پر مجھ کو بخوبی یقین ہے اور میرے دل کو بالکل تسلی ہے، کہتا ہوں کہ بہشت کا ملنا صرف جیسس کرائسٹ پر بھروسہ رکھنے پر منحصر ہے۔ اور کوئی راہ نہیں۔'' میں نے کہا ''صاحب میں کہہ چکا ہوں کہ ہر کوئی اپنے مذہب پر ایسا ہی اعتقاد رکھتا ہے۔'' بولے کہ ''کیا تم بھی محمد ﷺ پر ایسا ہی بھروسہ رکھتے ہو جیسا کہ میں دل سے جیسس کرائسٹ پر رکھتا ہوں'' چونکہ ان کا یہ سوال ہمارے اعتقاد مذہبی کے کسی قدر برخلاف تھا کیونکہ ہم کسی شخص پر بھروسہ نہیں رکھتے بلکہ خدائے واحد پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس لئے اس کا جواب دینے میں، میں نے تھوڑا سا تامل کیا اور اپنے دل میں یہ خیال کر کے کہ ہر گاہ خدائے واحد پر بھروسہ ہم کو بذریعہ رسول اللہ ﷺ حاصل ہوا ہے تو مجازاً ہم کو کہنا کہ ہم محمد ﷺ پر بھروسہ رکھتے ہیں، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں نے جواب دیا کہ ''ہاں!'' اس پر وہ بولے کہ ''تم کو دِلی اور کامل بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے خود تمہاری بات اور جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو اس پر بھروسہ اور مضبوطی نہیں ہے۔'' میں نے کہا ''آپ کے سوال میں کسی قدر غلطی تھی۔ سنیئے کہ مجھ کو اس بات پر کہ بہشت اور نجات حاصل ہونے کیلئے بجز اس کے کہ ایک خدا پر دل سے اعتقاد رکھنا اور اسی ایک کو پوجنا جس طرح کہ ہمارے سچے پیغمبر محمد ﷺ نے بتایا، اور کوئی رستہ نہیں اور میں اس بات پر ایسا یقین رکھتا ہوں جیسا کہ اس روشن ستارے کو جو ہمارے آنکھ کے سامنے ہے، دیکھ رہا ہوں۔'' یہ سن کر وہ خاموش ہو رہے۔ تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے۔ اور پھر اٹھ کر چلے گئے۔ اگرچہ مذہبی گفتگو ان کی مجھے

پسند نہ تھی مگر بایں ہمہ میری رائے ان کی نسبت یہ تھی کہ یہ شخص اپنے مذہب میں نہات متوجہ معلوم ہوتا ہے۔ضرور نہایت منکسر اور بااخلاق اور بموجب اصول اپنے مذہب کے غیروں سے محبت کرنے والا ہوگا۔ مگر افسوس کہ پھر میری یہ رائے قائم نہیں رہی۔اس لئے کہ اس کے بعد جب تک وہ جہاز میں رہے نہ کبھی میرے پاس آئے، نہ کبھی مجھ سے ملاقات کی، نہ صاحب سلامت کی۔ اگر کبھی اتفاقیہ پیش قدمی کر کے میں گڈ مارننگ کہتا تو ہاتھ سے سلام لیتے، کئی دفعہ میرا ارادہ ہوا کہ میں ان سے کہوں کہ اگر آپ میری کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں تو معاف کیجئے۔مگر چونکہ ان سے زیادہ واقفیت نہ تھی اور نہ ان کے مزاج کا حال معلوم تھا، اس لئے میں نے تامل کیا۔

میرے اندر مذہبی تعصب بالکل نہیں ہے۔ مذہبی مناظرہ سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں ہمیشہ اس سے گریز کرتا ہوں۔ بہرحال بمبئی سے لندن جاتے ہوئے۔ لیفٹیننٹ لارنس کے بعد ایک اور صاحب سے ملاقات ہوئی جو بظاہر تو محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے لیکن اپنے مذہبی عقائد میں کٹر تھے اور مناظرہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔

میجر ڈاڈ صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ناگپور بھی ہمارے جہاز میں تھے۔ انہوں نے مجھ سے صاحب سلامت کی اور بات چیت کی اور بہت اخلاق سے ملے۔ ان سے بہت زیادہ ملاپ ہوگیا۔ دبلے، چھریرے، بلند قد، ریش دراز اور نہایت بااخلاق اور نرم سخن آہستہ گو تھے۔ اب تک ان کی خصلتیں اور بات چیت مجھ کو نہایت پسند ہے۔ اور میں یقینی جانتا ہوں کہ بہمہ صفت موصوف اور بہمہ خوبی آراستہ تھے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھتے تھے اور بات چیت کرتے تھے۔ ولایت کا اور میرے ولایت جانے کے سبب کا اور ورنیکلر یونیورسٹی کا اور سررشتہ تعلیم میں جو جو نقصان ہیں ان کا اور لڑکیوں اور ان کیا سکولوں کا اور ان کی تعلیم کے لائق کتابوں کا مختلف وقتوں میں ذکر ہوتا رہا۔ انہوں نے کہا کہ میرے رائے میں بہت ضروری ہے کہ جب ہندوستانی نوکر ولایت جانا چاہیں تو ان کو گورنمنٹ پوری تنخواہ پر رخصت دے۔

میں میجر ڈاڈ صاحب کا درحقیقت نہایت ممنون ہوں کہ انہوں نے بہت سی باتیں جہاز میں مجھ کو بتلائیں۔ اور جونئی چیز ظاہر ہوتی تھی تو فی الفور میرے پاس آتے اور دکھاتے اور اس کا حال بتاتے تھے۔ میں ان کی اس مہربانی کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

اگرچہ بعض وجوہات سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں نہات پختہ یا متعصب ہیں مگر متعصب ہونے کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہوا۔ کیونکہ میں ان کو نہایت

مہذب اور بااخلاق آدمی خیال کرتا ہوں۔ اور ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں مگر تعصب کو نہایت برا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔

حالی: وہ کیا؟

سرسیّد: سمندری جہاز میں سفر کرنے سے سب مسافروں کی طبیعت پر کچھ نہ کچھ اثر پڑا۔ محمود Sea Sickness سے کئی دن بغیر کھائے پیئے بے سدھ پڑا رہا۔ جہاز کے ایک افسر نے محمود کا یہ حال دیکھ کر کہا کہ میں ڈاکٹر کے پاس سے ابھی دوا لاتا ہوں۔ اور خود جا کر گلاس میں دوا بنوا کر اپنے ہاتھ میں لایا۔ اور یہ بھی کہا کہ اس میں تھوڑی سی سپرٹ ہے، شراب نہیں ہے، دوا میں کام آتی ہے۔ محمود نے ان کا بہت شکر کیا اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف ہوئی مگر میں سپرٹ ہونے کے سبب نہیں پی سکتا۔ اول تو اس بے چارے نے بہت سمجھایا، جب محمود نے نہ مانا۔ اس نے کہا میں پھر جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ایسی دوا دو جس میں کسی قسم کی سپرٹ نہ ہو۔ چنانچہ وہ بے چارہ بغیر سپرٹ کے دوا بنوا کر لایا، محمود کو پلائی اور درحقیقت اس نے بہت فائدہ کیا۔

تعصب کو ایک بڑا نقص اخلاق انسانی میں اور نیچر یعنی حکمت الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں تو ایسے اچھے آدمی میں جیسے کہ میجر ڈاڈ صاحب ہیں، میں ایسا نقص کیونکر خیال کر سکتا تھا؟ مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں شکر باوصف بڑی لیاقت کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اس لئے نہیں ہوا کہ شاید وہ لامذہب ہے۔ اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ ''میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔'' کہنے لگے ''کیوں؟'' میں نے کہا ''جب ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے۔'' یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے، مشرک، بت پرست، خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے، اسی طرح گورنمنٹ اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔

جہاز میں عیسائیوں کی نماز

سرسیّد: جہاز میں بھی اتوار کے دن اسی طرح نماز ہوتی ہے جیسے خشکی میں۔ دستور ہے کہ اگر کوئی پادری جہاز میں نہ ہو تو جہاز کا کپتان نماز پڑھاتا ہے۔ ہمارے جہاز میں ریورنڈ اے ٹیلر کامٹی کے چیپلن جو میجر ڈاڈ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ناگپور کے بہت دوست تھے، جہاز میں

موجود تھے۔ اس سبب سے انہوں نے نماز پڑھائی۔ جہاز کی چھت پر سب انگریز جمع ہو گئے اور کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ گئے۔ اور موافق اپنے دستور و مذہب کے نماز ادا کی۔

میں بھی اسی مقام کے قریب جہاں نماز ہوتی تھی خاموش، مؤدب کھڑا تھا۔ اور کبھی ٹہلنے لگتا تھا۔ کیونکہ خدا کا نام ہر طرح ادب کے لائق ہے۔ اور نماز کے ادا کرنے کو دیکھ رہا تھا۔ اور خدا کی بے نیازی کی شان پر خیال کرتا تھا کہ عجب بے نیاز اور مستغنی ہے کہ اگر کوئی بت کے سامنے ڈنڈوت کرے تو اس کی کچھ پروا نہیں اور کوئی ٹوپی اتار کر اور کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھے تو کچھ پروا نہیں۔ اور اگر کوئی حبہ اور عمامہ پہن کر اور تسبیح گلے میں ڈال کر ہاتھ باندھ کر ناک رگڑے تو بھی کچھ پروا نہیں۔ اور اگر کوئی برا بھلا کہے، گالی دے، شرک کرے تو بھی کچھ پروا نہیں۔ بلاشبہ استغنیٰ اس پر ختم ہے۔

زعشق نا تمام ما جمال یار مستغنی است

بہ آب و رنگ، خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

میں اسی خیال میں تھا کہ نماز ختم ہو گئی۔ نمازیوں میں سے ایک ہمارے دانا دل دادصفت دوست نے پوچھا کہ تم نماز میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔ میں نے کہا کہ میں کیا شریک ہوتا۔ کہا ''کیوں؟ خدا تو ایک ہی ہے۔'' میں نے کہا ''یہی ایک وہاں نہ تھا۔'' سن کر چپ ہو گئے۔

سرزمین عرب کی پہلی جھلک

حالی: سرزمین عرب کی پہلی جھلک دیکھ کر آپ کی قلبی کیفیت کیا تھی؟

سرسیّد: چھ دن اور چھ رات اسی طرح پانی پانی میں چلے گئے۔ تب ۱۶ اپریل روز جمعہ کو علی الصبح بعد نماز فجر زمین مقدس عرب دکھائی دی۔ ہم کو اسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور میرے دل میں خیال گزرا کہ سبحان اللہ اسی وادی غیر ذی زرع میں سے خدا تعالیٰ نے ایسا نبی اولوالعزم، آخرالزماں، ختم پیغمبران ﷺ پیدا کیا۔ میں اسی خیال میں تھا کہ ہمارے محسن و شفیق میجر ڈاڈ صاحب نے مجھ سے آن کر کہا کہ ''پیغمبر ﷺ کی زمین دیکھی۔'' میں نے کہا ''ہاں دیکھا، یہی ہے جو ''Arab the Blessed'' یعنی رحمت کیا گیا عرب کہلاتا ہے؟'' اسی تاریخ کو عدن کے قریب کے پہاڑ دکھائی دیئے جہاں سے پہاڑ شروع ہوئے ہیں وہاں ایک مینار روشنی کا جہازوں کو بتانے کے لئے بنا ہوا ہے۔

(سفرنامہ، صفحہ ۸۶)

تعلیم اپنی زبان میں

سرسیّد: بڑودہ جہاز میں جو چھوٹے چھوٹے عہدہ دار ہیں اور صرف حرف شناسی کے طور لکھنا پڑھنا

جانتے ہیں وہ سب ان کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

حالی: اس کی کوئی خاص وجہ؟

سرسیّد: یہ نتیجہ صرف اس بات کا ہے کہ تمام علوم وفنون اسی زبان میں ہیں جو زبان وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر آج انگریزی زبان میں علوم وفنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں یا گریک میں یا فارسی عربی میں ہوتے تو آج تک تمام انگریز ایسے ہی جاہل رہتے۔ لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں۔ اور آئندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم وفنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے۔ جاہل اور نالائق رہیں گے اور کچھ عام تربیت نہ ہوگی۔

(سفرنامہ، صفحہ ۱۰۰)

ایک باہمت مسلمان آیا

سرسیّد کا دل سمندر تھا، جہاں جس میں صلاحیت (Talent)، حوصلہ، عزم دیکھتے تو ضرور اس کا نوٹس لیتے۔ اور دل سے تعریف کرتے۔

سرسیّد: بڑائی کسی کی میراث نہیں ہے۔ پونا جہاز میں ایک ایسی مسلمان آیا تھی جو عجوبے میں نہر سویز سے کم نہیں تھی۔

حالی: وہ کون؟

سرسیّد: مسماۃ نصیبن آیا، مسز کوپر ڈپٹی کمشنر لکھنو کے ساتھ اسی جہاز میں تھی۔ وہ بھی نہر سویز سے کچھ کم عجیب نہیں تھی۔ یہ آیا کانپور کی رہنے والی تھی۔ قوم پٹھان، مسلمان تھی۔ اس کا بیان تھا کہ اس کو یورپ میں آتے ہوئے اکیسویں دفعہ ہے، ہمیشہ انگریزوں اور ان کے بچوں کو ٹھیکہ پر ولایت پہنچانے آتی ہے اور پہنچا کر چلی جاتی ہے۔ انگریزی بخوبی بولتی ہے، انگلینڈ، سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، فرانس اور پورچگل، لیزین اور اور مقامات یورپ کے اس نے دیکھے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ شاباش تو تو مردوں سے بھی اچھی ہے۔

ایک دفعہ میں اس سے کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا، ہمارے شفیق دوست میجر ڈاڈ صاحب بہادر بھی وہاں آ کھڑے ہوئے، میں نے آیا سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ اس نے کہا، محمدن یعنی مسلمان۔ میجر ڈاڈ صاحب نے یا تو دل لگی سے یا طنز سے مجھ سے کہا ''تمہاری قوم؟'' میں نے نہایت خوشی اور صدق دلی سے کہا کہ ''بے شک ہماری قوم، بلاشبہ تمام انسان ہمارے نسلی بھائی ہیں۔ اس لئے کہ ایک باپ سے پیدا ہوئے اور سب مسلمان ہمارے مذہبی بھائی ہیں جو ایک خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔''

سابق ڈپٹی کمشنر، دہلی سے کھری کھری باتیں

سرسیّد کی پہلی محبت اپنی قوم تھی۔ اسی کی خاطر وہ غیروں سے تعاون کرتے تھے۔ لیکن جب موقع ملتا وہ غیر ملکی حاکموں پر تنقید سے گریز نہیں کرتے تھے۔

حالی: پونا جہاز پر میجر ڈاڈ کے علاوہ اور کس کس سے ملاقات دلچسپ رہی؟

سرسیّد: میجر ڈاڈ کے علاوہ اس جہاز میں اور بھی کئی نئے صاحبوں سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے وینس فٹز پیٹرک صاحب سابق ڈپٹی کمشنر، دہلی بھی اس جہاز میں تھے۔ اگرچہ مجھ سے ان کی پہلے کبھی ملاقات نہیں تھی مگر نہایت مہربانی سے ملے۔ ایک دن پنجابی انتظام کی بھلائی برائی کا ذکر آیا، میں نے کہا کہ ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزاروں درجے بہتر ہے، شاید پنجاب کے لوگ خوش ہوں اور پسند کرتے ہوں کہ ان کو آگ میں سے (یعنی سکھوں کی عملداری میں سے) نکال کر دھوپ میں لا بٹھایا ہے۔ مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کر سکتے۔ پنجاب گورنمنٹ کے بے قانونی ملک کی گورنمنٹ کی بھلائی یا برائی دہلی، پانی پت، رھتک، حصار، سرسہ وغیر اضلاع سے پوچھنی چاہیے جو ایک زمانے میں قانونی ملک تھا۔ اور اب بے قانونی کے تحت انتظام پنجابی ہے۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سزائیں اہل دہلی اور اس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ انہی سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا۔ اور بے قانونی ملک بنایا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے۔ اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانے کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں۔ اور جن سے ان برائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ مصرع ہے:

چو رگ زن کہ جراح و مرہم نہ است

اب ان کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ وہ لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان میں بجائے کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ کے ڈسپاٹک گورنمنٹ جیسی قدیم کہ قدیم ہے، زیادہ تر مفید ہوگی، وہ نہایت غلطی پر ہیں۔ ان کی مثال ہے جیسے کوئی شخص کسی باغ کو صرف موسم خزاں میں دیکھ کر اس کی بھلائی کی نسبت رائے لگائے اور موسم بہار کا وہ کبھی خیال نہ کرے۔

(سفرنامہ، صفحہ ۱۱۷)

مصر کا ریلوے نظام

حالی: انگلستان جاتے ہوئے آپ نے مصر میں بھی چند روز قیام کیا تھا۔ وہاں کیا دیکھا؟

سرسیّد: بہت کچھ دیکھا۔ لیکن میں جو کچھ دیکھتا ہوں وہ قومی غیرت سے دیکھتا ہوں۔ مصر کا ریلوے نظام بہت اچھا تھا۔

ریلوے کارکن سب مصری تھے

سرسیّد: مصری ریل پر کام کرنے والے اور ریل چلانے والے اور گارڈ، خلاصی، چپراسی وغیرہ سب مصری اور ترک تھے۔ اور نہایت مشاق تھے۔ اور بہت ہوشیاری اور چالاکی سے کام کرتے تھے۔

تمام ریلوے آلات غیر ملکی تھے

سرسیّد: مصر کی ریل کے کارخانے میں جو چیز قابل غور کے تھی، وہ یہ تھی کہ تمام گاڑیاں اور پانی دینے کے ستون اور ریل کی سڑک اور ہر قسم کی چیزیں جو کچھ کہ ریل کے کارخانوں میں درکار ہوتا ہے، یہاں تک کہ لوہے کی ایک کیل بھی، وہ سب انگلستان یا فرانس کا بنا ہوا پایا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مصر یا ترکستان کی بنی ہوئی نہ تھی۔

(سفرنامہ، صفحہ ۱۱۱)

مصریوں اور ہندوستانیوں میں فرق

سرسیّد: البتہ بہ نسبت ہندوستان کے، مصر والوں کی اس قدر تعریف کرنی چاہیے کہ وہ خود ان سب چیزوں سے کام کرنے اور کام لینے کے لائق ہیں، ہندوستانی بدبخت اس لائق بھی نہیں ہوئے۔

تمام علوم وفنون کی تعلیم اپنی ملکی زبان میں ہونی چاہیے

سرسیّد: اور جب تک کہ تمام علوم وفنون انہی کی زبان میں نہ مروج ہوں گے اس وقت تک ہرگز لائق نہ ہوں گے۔ مصر والوں کو جو اس قدر لیاقت آئی ہے صرف اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان چیزوں سے کام لینے کے فنون انہی کی زبان میں مروج ہو گئے ہیں۔

مصریوں میں صفائی کا فقدان

سرسیّد: دوسری بات، قابل افسوس کے، یہ تھی کہ تمام کارخانہ بہ نسبت انگریزی کارخانے کے، نہایت میلا کچیلا تھا، ریل کی سڑک اور سٹیشنوں میں مطلق صفائی نہ تھی، ایسی میلی تھیں کہ شاید مہینوں میں صاف ہوتی ہوں گی۔ پانی دینے کے آہنی ستون نہایت عمدہ اور خوبصورت بیل بوٹے مرغولہ دار بنے ہوئے تھے مگر ان پر انگل انگل بھر موٹی اور خاک مٹی جمع ہوئی تھی۔ نہروں کا جو میں نے بیان لکھا ان کا بھی یہی حال تھا۔ کسی جگہ میں پٹڑی بنی ہوئی نہیں دیکھی، نہر کھودتے وقت جو کناروں پر مٹی ڈالی تھی اس طرح پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ایک تکلیف دہ گفتگو

سرسیّد: مصر سے ہم پونا جہاز سے یورپ کی طرف عازم سفر ہوئے۔
میجر ڈاڈ صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن سے جن کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، ایک تکلیف دہ گفتگو ہوئی۔

حالی: وہ کیا؟

سرسیّد: جس دن جہاز روانہ ہوا اسی دن کھانے کے بعد میجر ڈاڈ صاحب نے کہا کہ اب یورپ آ پہنچے۔ میں نے ادب آمیز اخلاق سے ان کو تسلیم کیا۔ اور بشاشت کے ساتھ یہ بات کی کہ ہاں آج ہماری منزل یورپ کے ملک میں ہے۔ ڈاڈ صاحب نے کہا کہ ہاں اب پیغمبر ﷺ کا ملک چھوٹا، کافروں کا ملک آیا، اگرچہ اس میں انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس میں ہم کچھ برا مانتے۔ اور جو سخت یا نامناسب...... انہوں نے کہا وہ اپنی یا اپنی قوم کی نسبت کہا مگر ان کا طرز کلام مجھ کو نہایت ناپسند آیا۔ اور طبیعت کو بہت ناگوار گزرا۔ اور میں نے خیال کیا کہ ایسی لے (طرز) میں گفتگو کرنا کیسا اخلاق اور تہذیب کے برخلاف ہے اور ایسے عمدہ اور متین اور حلیم ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی زبان سے اس طرز پر کیوں گفتگو ہوئی۔ خیر، میں نے چند دم توقف کر کے کہا "یوں نہ کہیے بلکہ یوں کہیے کہ اہل کتاب کا ملک آیا۔" مگر کئی گھنٹے تک مجھ کو بڑا خیال رہا اور میں سوچتا رہا کہ ان کی طینت اور طبیعت کس قسم کی ہے۔ مگر آخر میں نے خیال کیا کہ غالباً ان کی گفتگو کسی قسم کے تعصب کی راہ سے نہ تھی، اتفاقیہ سہل طور پر ان کی زبان سے نکل گیا۔ اور جو کبیدگی میرے دل میں آئی اس کو میں نے نکال دیا۔

(سفرنامہ، صفحہ ۱۱۵)

ایک وطن دوست کا احترام

سرسیّد بنیادی طور پر ایک قوم پرست اور ملکی آزادی کے دلدادہ اور جمہوریت پسند انسان تھے۔ انیسویں صدی کے وسط میں برطانیہ کے عظیم قوم پرست گیری بالڈی کا بڑا شہرہ تھا۔ سرسیّد کا دل اتنا بڑا تھا کہ دنیا جہاں بھی کوئی ملکی آزادی کا دلدادہ اور قوم پرست تھا، وہ اس سے عقیدت رکھتے تھے۔

حالی: سفرنامہ آپ نے گیری بالڈی کا ذکر کیا ہے۔ گیری بالڈی کے گھر کی زیارت کر سکے؟

سرسیّد: جی ہاں۔ افسوس ہے کہ ہمارا جہاز کیپریا کے مقابل اور آبنائے بونی فیشیو میں رات کو گزرا۔ اور اس سبب سے کیپریا جہاں اس زمانے کے دلاور اعظم گیرے بالڈی کا گھر ہے اور جزیرہ کارسیکا جہاں شہنشاہ نپولین پیدا ہوا تھا اور جزیرہ سارڈینیا دکھائی نہ دیئے۔ مجھ کو کمال آرزو تھی کہ اس زمانے کے سب سے بڑے فیاض، دلاور، گیری بالڈی کے پھونس کے جھونپڑے

کی جو بڑے بڑے قیصروں کے محلوں سے بھی زیادہ معزز اور قابل ادب و تعظیم ہے، زیارت کروں۔ مگر افسوس کہ رات ہونے کے سبب یہ دولت اور یہ نعمت مجھ کو نصیب نہیں ہوئی۔
(سفر نامہ، صفحہ ۱۲۲)

نہر سویز کے انجینئر سے ملاقات

سرسیّد کی شخصیت کی بنیادی قدر قوم پرستی تھی۔ قوم دوست کسی قوم کا ہو، وہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حالی: سابق ڈپٹی کمشنر دہلی کے علاوہ کوئی اور یادگار ملاقات؟

سرسیّد: ان سب ملاقاتوں سے زیادہ جن کا ذکر میں نے کیا، سب سے اہم ملاقات ایک ایسے باکمال قوم پرست، جسے دنیا نہر سویز بنانے والے انجینئر کی حیثیت سے جانتی ہے، ڈی لیپس سے ہوئی۔ دل خوش ہو گیا۔ اپنی قوم کا ایسا دلاور و شیدا آسانی سے کہاں ملتا ہے۔

حالی: ڈی لیپس صاحب کے احوال ذرا تفصیل سے بتائیے۔

سرسیّد: نہایت خوشی اور بہت ہی مسرت جو اس جہاز میں ہوئی وہ مسٹر ڈی لیپس صاحب بہادر سے ملاقات ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ یہ صاحب وہ فرانسیسی انجینئر ہیں جنہوں نے نہر سویز بنانے کی تجویز کی اور باوجودیکہ تمام یورپ کے بڑے بڑے انجینئر کہتے تھے کہ اس نہر کا بننا غیر ممکن ہے مگر صرف اسی عالم اور دانا اور دلاور انجینئر کی تجویز تھی کہ بے شک بنے گی اور میں بناؤں گا۔ چنانچہ جیسا اس نے کہا تھا ویسا کر دکھایا۔ دو سمندروں کو ملایا اور سویز کی نہر کو بنایا۔ یہ صاحب جناب پرنس آف ویلز کے ساتھ تھے جب کہ جناب موصوف نہر سویز کے ملاحظے کو تشریف لائے تھے۔ اور سویز سے اس جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ ایک دن کے بعد مجھے ان کا حال معلوم ہوا۔ وہ انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔ ہمارے جہاز کے کپتان نے جو فرانسیسی جانتے تھے میری ملاقات کرائی۔ بہت اخلاق اور تواضع سے ملے۔ اور نہایت خوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس وقت معلوم ہوا کہ کسی قدر عربی بول لیتے ہیں۔ میں نہایت خوش ہوا۔ اور چند باتیں عربی میں کیں۔ مگر عربی میں بہت تھوڑی، عام باتیں کر سکتے تھے۔ کوئی مضمون یا لمبی بات نہیں کہہ سکے۔ اس دن سے برابر ہمیشہ نہایت مہربانی سے ملتے رہے اور ہر روز گھنٹوں تک میں اور وہ ایک میز پر بیٹھے لکھا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے سب لوگوں کے سامنے نہر سویز کا حال بیان کیا اور بعض پرانی نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت کی جو اس کے قرب و جوار میں ہیں، بیان کیں۔ مجھ سے کہنے لگے "جب تم ولایت سے پھرو گے تو امید ہے کہ نہر کے راستے تمہارا جہاز جاوے گا۔" ان کا بیان تھا کہ چھ مہینے بعد نہر بالکل جاری ہو جائے گی۔

اور بڑے بڑے جہاز اور سٹیمر اس میں آمدورفت کریں گے۔ غرضیکہ ایسے شخص کی ملاقات سے جو دلیری اور جرات میں بھی ایسا ہی کامل ہے جیسا کہ اپنے فن میں اور حقیقت میں یکتائے دہر و بے نظیر ہے، مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ بلکہ میں میں نے اپنا فخر سمجھا۔
(سفر نامہ، صفحہ ۱۱۸)

جہاز میں انجینئر نہر سویز کو ایڈریس اور اس کا نہایت قابل تعریف اور مخلصانہ جواب

سرسیّد: جب کہ ایک دن مارسیلز پہنچنے کا باقی رہا تو تمام انگریزوں نے جو جہاز میں تھے، صلاح کی کہ ڈی لیپس صاحب کو ان کی کامیابی نہر سویز پر ایک ایڈریس بطور مبارکبادی کے، دیا جاوے۔ چنانچہ ۲۸ مئی کو کھانے کے بعد ایڈریس پیش کیا گیا۔ اول کپتان صاحب نے بہت لمبی سپیچ کی اور پھر مسٹر اوزلی نے۔ اور اس کے بعد جنرل ٹیپ صاحب نے، اس کے بعد مسٹر بٹیلٹ نے، اس کے پیچھے مسٹر سانڈرس نے۔ تب ایک مختصر ایڈریس مبارکبادی انجام و کامیابی نہر سویز جس میں تمام لوگوں کے جو جہاز پر تھے، دستخط تھے ان کو دیا گیا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر اس کو لیا اور جواب میں ایک لمبی سپیچ بطور شکریہ فرانسیسی زبان میں کی۔ عمدہ الفاظ قابل یادگاری جو ان تمام سپیچوں میں تھے، وہ یہ ہیں۔
جنرل ٹیپ صاحب نے اپنی سپیچ میں کہا تھا کہ نہایت زیبا ہے کہ بجائے نہر سویز کے نہر لیپس اس کا نام رکھا جاوے۔ بلاشبہ ان کا یہ کہنا بہت بجا تھا کہ اس کی جہاں تک قدر اور یادگاری اور عزت کی جا سکے وہ کی جاوے۔ جب کہ مسٹر ڈی لیپس نے سپیچ کی تو اس میں انہوں نے کہا کہ میری خوشی اور میرا فخر اس میں نہیں کہ اس نہر کا نام ڈی لیپس ہو بلکہ میری خوشی اور میرا فخر اس میں ہے کہ یہ نہر فرنچ نہر کہلاوے۔

انجینئر صاحب کے جواب پر سرسیّد کے خیالات

سرسیّد: جس وقت کہ میں نے بذریعہ ایک دوست کے جو وہاں موجود تھا، یہ مضمون سمجھا، میرے دل میں ایسا جوش پیدا ہوا کہ گویا میں اس کی آواز سنتا تھا۔ اور میں اس دلاور آدمی کی اس فیاضی پر کہ اپنی قوم کی نام آوری پر ایسا خوش ہے کہ اپنی خوشی اور اپنی عزت اس میں سمجھتا ہے، ہزار آفرین کی اور اپنی قوم پر جن کا کام بجز حسد اور بغض اور اپنی جھوٹی شیخی جتانے کے اور کچھ نہیں ہے، افسوس کیا اور یقین جانا کہ ایسی ہی خصلتوں سے ان کو بدنصیبی و ذلت نے گھیرا۔
"لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا."
یہ بھی واضح ہو کہ درحقیقت یہ نہر فرنچ نہر کے نام سے مشہور ہے۔ سویز میں عموماً تمام آدمی قلی

سے لے کر بھلے مانس تک، فرنچ کنال، فرنچ کنال، اس کا نام لیتے ہیں۔ درحقیقت فرانسیسیوں نے یہ ایسا بڑا کام کیا ہے کہ اگر اس سے نیا سال شروع کیا جائے تو بھی زیبا ہے۔

(سفر نامہ، صفحہ ۱۱۹)

فرانس کی ایک پکچر گیلری پر تنقیدی نظر

سرسیّد بھی ایک ہمہ گیر جینئس تھے۔ سفر نامہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ جہاں جہاں سے وہ گزرے اس کے طبعی حالات، تاریخ، کوچہ و بازار، عوام و خواص، پکچر، سب کا جائزہ ہے۔ لندن جانے سے پہلے چند روز کیلئے پیرس میں سرسیّد کا قیام رہا۔ اس عرصہ میں انہوں نے بطور خاص ایک قدیم شاہی محل میں قائم شدہ فرانس کا مشہور میوزیم اور تصویر خانہ دیکھا۔ اور تنقیدی نظر سے تصویروں کا جائزہ لیا۔ ان کے مضمرات کو سمجھا۔

حالی: پیرس میں آپ کی مصروفیات کیا رہیں؟

سرسیّد: سفر نامہ میں بہت تفصیل سے فرانس میں اپنے مشاہدات کا ذکر کر چکا ہوں۔ لیکن میں آپ کے سوال کے جواب میں شاہی محل کے مشہور تصویر خانہ کا ذکر کروں گا۔

ایک تصویر پر قومی عصبیت کے نقطہ نظر سے اعتراض

دراصل شاہی محل کے اس تصویر خانہ میں ایک تصویر ایسی بھی تھی جس سے سرسیّد کی قومی عصبیت کو سخت دھچکا لگا۔

حالی: تو گویا آپ کو فرانسیسی قومی حمیت نے متاثر کیا؟

سرسیّد: ضرور کیا لیکن اس تمام تصویر خانے میں صرف ایک ہی بات تھی جو فرنچ کی شجاعت اور سویلائزیشن (تہذیب و شائستگی) کو بٹا لگاتی تھی۔ اور مجھ کو اسے دیکھ کر نہایت تعجب ہوا کہ ایسی بہادر اور شجاع اور سپاہی قوم نے جو سویلائزیشن کے زیور سے بھی نہایت آراستہ ہے، ایسی عجیب بات جو ان سب خوبیوں کے برخلاف ہے، کیونکر کی ہے؟ الجزائر کے محاربات کی تصویروں کے کمرے میں امام عبدالقادر کی عورتوں کو گرفتار کرنے کی تصویر بنائی ہے۔ اس کی عورتیں اونٹ پر کجاوے میں تھیں، فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو بٹھا کر کجاوہ گرا دیا ہے۔ اور عورتیں اس میں سے نکل پڑی ہیں۔ اور ان کے بدن پر سے کپڑا ہٹ گیا۔ اور فرنچ سپاہی سنگین اٹھائے ہوئے اور ان کی نوکیں عورتوں کی طرف کئے ہوئے کہ گویا اب ماریں گے، گرد کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا کہ عورتوں کی گرفتاری کی تصویر اپنے محل میں لگاتے؟ کیا عورت پر سنگین سیدھی کرنی اور اس کو کجاوے میں سے گرا دینا فرنچ سپاہیوں کی بہادری کی یادگار تھی؟ کیا ایک عورت کا تصویر میں کپڑا بدن پر سے ہٹا ہوا بنا دینا (بالفرض اگر ایسا ہوا بھی ہو) فرنچ کی سویلائزیشن کے مناسب تھا؟

ایک قابلِ تعریف تصویر

سرسیّد: مگر اسی کے پاس ایک دوسری تصویر ہے جس سے فرنچ کی اور خصوصاً حال کے شہنشاہ نپولین کی فیاضی اور دانائی اور ہمت اور تمام خوبیاں ثابت ہوتی ہیں۔ جب کہ شہنشاہ تخت پر بیٹھا تو امام عبدالقادر کو قید سے چھوڑ دیا۔ خود شہنشاہ قید سے اس کو چھوڑ رہا ہے، شہنشاہ نپولین کے پورے قد کی تصویر ہے، اس کے پاس امام عبدالقادر کھڑا ہے۔ اور اس کے سامنے امام عبدالقادر کی ماں باہر پھرنے کا ڈریس (لباس) پہنے ہوئے کھڑی ہے، شہنشاہ نپولین امام عبدالقادر کی ماں سے شیک ہینڈ (مصافحہ) کر رہا ہے۔ اور عبدالقادر کی آزادی کا حکم دیتا ہے۔ درحقیقت اس تصویر میں شہنشاہ نپولین کی شہنشاہی برس رہی ہے۔ اور تمام قوم کا فخر اور عزت اور سویلائزیشن کی آراستگی اس سے معلوم ہوتی ہے۔

آرٹ کے مبصر کی نگاہ

سرسیّد کا سفرنامہ لندن پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ یہ شخص، مبصر، محقق، بیک وقت سب کچھ ہے۔

حالی: پیرس میں آپ نے اور کیا کیا دیکھا؟

سرسیّد: پیرس کے مضافات میں فرانسیسی شہنشاہ چہارم کا قدیم محل بھی دیکھا۔ اس میں بھی تصویر خانہ میری دلچسپی کا مرکز رہا۔

حالی: وہاں خاص طور پر کس چیز نے آپ کو متاثر کیا؟

سرسیّد: اس تمام محل میں مصوروں کا کام بے نظیر ہے۔ لیبرن، منکارڈ، گوپل، ریکارڈ، جوئی نت، لیموں جو نہایت نامی مصور تھے۔ ان سب کا اس میں کارنامہ ہے۔ وہ کمرہ جو تصویر خانہ سلطنت کے نام سے مشہور ہے اور جس میں تیرہ کمرے اور شامل ہیں، نہایت عمدہ بنا ہوا ہے اور اس میں ایک سوتیس کارنامے تصویروں کے پورے پورے قد کے بنے ہوئے ہیں۔ شہنشاہ نپولین کی فتوحات اور محاربات کی تصویریں پورے پورے قد کی بنی ہوئی ہیں۔

ایک اور بہت بڑا کمرہ ہے جس کا نام کمرہ کروسیڈ ہے۔ اس کمرے میں تمام واقعات و محاربات کی تصویریں جو کہ کروسیڈ کی لڑائی (محاربات صلیبی) میں ہوئی تھیں، بنی ہوئی ہیں۔

اس کمرے کے اوپر ایک اور کمرہ ہے۔ اور اس میں تمام واقعات اور محاربات الجزائر کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ایک بہت بڑے کمرے میں جو ۳۷ فٹ لمبا اور ۴۲ فٹ مرتفع ہے، تمام لڑائیوں کی تصویریں جو فرنچ لڑے ہیں، بنی ہوئی ہیں۔

تصویروں کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ سب کچھ سچ مچ کا ہے۔ جو لوگ زخمی

ہوئے ہیں صاف گولی لگی ہوئی اور گوشت ابھرا ہوا اور پھٹا ہوا اور خون بہتا معلوم ہوتا ہے۔
یہ تصویر خانہ نہیں بلکہ قومی ہمت اور قومی جرأت اور قومی شجاعت بڑھانے کا آلہ ہے۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ تمام قوم فرنچ کی جب ان تصویروں کو دیکھتی ہوگی اور اپنے بزرگوں کی بہادری اور شجاعت اور میدان جنگ میں مرنا اور اپنے تن بدن کو زخموں سے چور کرنا اور مرنا یا مارنا خیال کرتی ہوگی، اس کی ہمت اور شجاعت دگنی ہو جاتی ہوگی۔ اور چلوؤں خون بڑھ جاتا ہوگا۔

قیام لندن

لندن میں سرسیّد کی علم دوستی اور قومی خدمت کے حوالے سے بڑی پذیرائی ہوئی۔ لارڈ لارنس اکثر ملنے آتے تھے۔ بڑے بڑے امرأ اور روسأ سے ملاقات رہی۔ ملکہ وکٹوریہ اور پرنس آف ویلز کی ملاقات سے باریاب ہوئے۔ وہ وہاں ممتاز ایتھم کلب کے اعزازی رکن مقرر ہوئے۔ ان کا مستند تعلیمی مطالعہ کیا۔ حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''ان کے اصل مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے کیمرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا۔ اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی سے علاقہ رکھتی تھی غور کیا اور اس کا تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا۔ پھر ملک کی عام تعلیمی حالت کا اندازہ کیا، تعلیم نسواں کو غور کی نگاہ سے دیکھا اور تعلیم کے مختلف طریقوں میں سے جو طریقہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کے مناسب سمجھا، اس کو نگاہ میں رکھا۔ اگرچہ انگریزی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے ضرور ہے کہ ان کو ہر ایک بات کے سمجھنے اور دریافت کرنے میں سخت دقتیں اٹھانی پڑی ہوں گی۔ اور شاید ان کو پوری واقفیت حاصل نہ ہو سکی ہو۔ مگر جو نتیجے ان کی اس ادھوری واقفیت سے ہندوستان میں ظاہر ہوئے، وہ بلکہ ان کا عشر عشیر آج تک ان ہندوستانیوں کی پوری واقفیت سے بھی ظہور میں نہیں آیا جو ولایت سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر آئے ہیں۔''

انگلستان کی تعمیر و ترقی پر غور

انگلستان کے طریقہ تعلیم پر غور کرنے کے بعد سرسیّد نے لندن میں ایک پمفلٹ انگریزی میں شائع کیا۔ جس میں ہندوستان کے طریقہ تعلیم کے نقصانات تفصیل کے ساتھ ظاہر کئے تھے۔ تعلیم کے سوا یورپ کی عام شائستگی اور طرز تمدن اور حسن معاشرت اور ہر قسم کی ترقیات کے اسباب جیسا کہ ان کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے، ملاحظہ کئے۔ وہاں ان کے امرأ کے محل اور مکانات اور طرز ماندو بود پر نظر کی۔ عجائب خانوں اور کتب خانوں میں علوم اور تحقیقات کے ذخیرے ملاحظہ کئے۔ انجینئری کے عجائبات، جہازوں کی تیاری، توپوں کا ڈھلنا، سمندر کے تار کا بننا، انجینئروں اور عالموں کی سوسائٹیاں، عام کاریگروں اور اہل حرفہ کے کام اور عموماً اہل انگلستان کے علمی ذوق وشوق اور علمی ترقیات کو دیکھا۔ جس سرگرمی کے

ساتھ اہل مذہب، مذہب کی حمایت کرتے ہیں اور باوجود اس کے نہایت بے تعصبی سے غیر مذہب والوں کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اور جو اخلاق کہ وہ پردیسیوں اور مہمانوں کے ساتھ برتتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھا۔ ان کے عیبوں سے قطع نظر کی اور ان کی خوبیوں کو چنا۔ اور یہ سب کچھ ایک تماشائی کی طرح سیر تماشے اور دل لگی کے طور پر نہیں بلکہ ایک وطن دوست کی طرح دلسوزی، غیرت اور عبرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور انگلستان کی حالت کو اپنے ملک کی حالت سے مقابلہ کر کے اپنے درد دل کو بڑھایا۔ اور اس درد کو دوسروں کے دلوں میں درد پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ مولوی سیّد مہدی علی خان کو ایک خط میں ولایت سے لکھتے ہیں:

''میرے ایک معزز دوست نے ایک بہت بڑے جلسہ میں جہاں نہایت تکلف کی پوشاک پہنے کئے سو مرد اور لیڈیاں خوبصورت، خوش کلام اور قابل جمع تھیں، پوچھا کہ ''کہولندن بہشت ہے؟ اور حوروں کا ہونا سچ ہے یا نہیں؟ مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور قوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج وغم زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔''

ان کا ارادہ تھا کہ انگلستان اور ہندوستان کی حالت میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے، اس کو اپنے سفر نامہ میں مفصل بیان کر کے اہل وطن کو خبردار کریں۔ مگر اہل وطن نے اس کو برداشت نہ کیا۔ وہ اپنی پستی کی دردانگیز داستان نہ سن سکے۔ اور اس لئے جو سلسلہ سرسیّد نے اپنے سفر نامہ کے حالات لکھنا شروع کیا تھا وہ منقطع ہو گیا۔ بایں ہمہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے سفر کے جستہ جستہ حالات لکھنے سے دست بردار نہیں ہوئے۔ اور جب کبھی موقع ملا انہوں نے کوئی نہ کوئی بات اہل وطن کے کان میں ڈال دی۔

۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو انہوں نے ایک لمبی تحریر سوسائٹی اخبار میں چھپنے کو بھیجی جس میں چھ مہینے کے حالات مختصر طور پر بیان کئے تھے اور یورپ کی ترقی اور اپنے ملک کے ادبار اور تنزل کی مثالیں پیش کر کے اہل وطن کو غیرت دلائی تھی۔ جب اس تحریر کا نتیجہ بھی سوا اس کے کہ لوگ برافروختہ ہوں اور برا بھلا کہیں، کچھ حاصل نہ ہوا تو ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء کو ایک دوسری تحریر بعنوان ''عذر از طرف گنہگار سیّد احمد'' ہندوستان میں بھیجی۔ پھر ایک اور تحریر بعنوان ''عرضداشت سیّد احمد بخدمت اہل وطن'' اخبار میں چھپنے کیلئے روانہ کی۔ ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں سرسیّد کو اہل وطن کی بھلائی کا کتنا درد تھا۔

نواب محسن الملک اپنی ایک تحریر میں آنریبل حاجی اسماعیل خان کو لکھتے ہیں کہ:

''سیّد احمد خان ولایت گئے۔ مگر اس سبب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام

اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی تھی، انہی کے گھروں میں اور انہی کے ملک میں دیکھیں۔ اور جو کچھ وہاں دیکھا تھا واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت میں جا کر تماشہ گاہ، تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارت کی سیر کرتے ہیں۔ اور یہ حامی دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا۔ اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا ولایت جانا قوم کے واسطے تھا، رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے۔"

الغرض سر سیّد ایک سال اور پانچ مہینے لندن میں قیام کرنے کے بعد ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو مع سیّد حامد کے لندن سے ہندوستان کو روانہ ہوئے۔

دل لخت لخت

سر سیّد ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے تو اپنے بیٹے سیّد محمود کی تعلیم کے انتظامات کے سلسلہ میں تھے۔ لیکن جو سترہ مہینے انہوں نے وہاں گزارے وہ اس آگ کی نذر ہو گئے جو قوم کے درد میں ان کے دل میں لگی ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں:

"ولایت کا سفر جو سر سیّد نے ۱۸۶۹ء میں کیا اگرچہ بظاہر اس غرض سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو تعلیم کیلئے انگلستان لے جا کر اس کے آرام و آسائش و تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے کریں اور اس کی طرف سے ہر طرح کا اطمینان حاصل کر کے واپس چلے آئیں مگر جن مشغلوں اور جن منصوبوں میں انہوں نے سترہ مہینے لندن میں بسر کیے ان سے صاف پایا جاتا ہے کہ بیٹے کی تعلیم کا صرف ایک بہانہ تھا۔ ورنہ اصل منشا اس سفر دور و دراز کا قوم کی خیر خواہی اور اسلام کی حمایت کے جوش کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی لگن اور سر سیّد کا حال بعینہٖ اس شعر کے مصداق تھا:

ترک للناس دنیاھم و دینھم
شغلا لحبک یا دینی و دنیائی
لوگوں کو اپنا دین دنیا مبارک، اے محبوب!
میرا تو دین بھی تو اور دنیا بھی تو

مذہب اسلام کی خدمت جو کچھ کہ وہاں ان سے بن آئی۔ اس سفر کے آغاز سے لے کر انجام تک برابر ان کو مسلمانوں کی کس قدر لگی رہی ہے۔ اور ان کے آرٹیکلوں سے جو وقتاً فوقتاً وہ سوسائٹی کے اخبار میں چھپنے کیلئے ولایت سے ہندوستان میں بھیجتے رہے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان سے جاتے وقت جو حالت کہ وہ مسلمانوں کی دیکھ گئے تھے اس سے

ان کے دل پر عجب بے چینی اور قلق کا عالم تھا۔ خصوصاً ان کے دل کی کیفیت اور تلاطم ان پرائیویٹ خطوں کے دیکھنے سے بالکل آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے جو انھوں نے اپنے ہمدرد اور دلی دوست سیّد مہدی علی خان کو ولایت سے بھیجے۔"

سر سیّد کے ایسے خطوں کے چند ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں:

"اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو۔ اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے؟ اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آ کر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود، گردن مروڑی ہوئی مرغی کھانے والے، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا؟"

ایک اور خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

"جس کتاب کے چھاپہ ہونے کا اشتہار میں نے بھیجا تھا وہ تمام ہو گئی۔ ہفتہ یا دو ہفتہ کے بعد اس کے نسخے آپ کے پاس بھیجوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مصنف نے کیسا انصاف اور کیا سچ اختیار کیا ہے۔ گو بعض خیالات اس کے ہمارے خیلات کے مطابق نہ ہوں۔ وہ مسلمان نہیں ہے، انگریز ہے، جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔"

"اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہی تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو بات کہ از راہ انصاف اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لئے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جس میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف کے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"

"دو بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے۔ ایک واقعہ اندلس کا ہے۔ جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی عیسائیوں پر حکومت رہی۔ اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی، کی نہایت ہی عجیب اور قابل فخر ہے۔ دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے۔ یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور عیسائی قوموں سے بیت المقدس

پر ہوئیں۔ میں نے ان عالم صاحب (یعنی جان ڈیون پورٹ) سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں۔ اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور ان کی منصفانہ رائے میں ہو، سب لکھیں۔ اور چونکہ وہ نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن، لیٹن، فرنچ، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اس کو بھروسہ نہیں ہے۔ اس لئے امید ہے کہ جیسی بلاتعصب اس نے یہ کتاب (یعنی اپالوجی) لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا۔ ان دونوں کتابوں کے چھپنے اور تیار ہونے میں آٹھ سو روپیہ تخمیناً صرف ہوگا۔ فی کتاب چار سو روپیہ۔ بس میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں کے احباب سے آٹھ سو روپیہ چندہ کر کے میرے پاس بھیج دیں۔ چندہ کرنے میں شہرت نہیں چاہیے۔ صرف احباب مخلصین سے چندہ ہو۔ مثلاً آپ، میر ظہور حسین، زین العابدین، مرزا رحمت اللہ اور دوسرے احباب سے ملاقات کریں اور زبانی بات چیت کریں اور جو جس کی توفیق ہو اس سے لے کر جمع کریں۔"

مولوی سیّد مہدی علی خان کیلئے ہندوستان میں صاحب کمشنر نے "خلعت کیلئے گورنمنٹ میں رپورٹ کی ہے اس کی مبارک باد کے بعد سر سیّد ان کو لکھتے ہیں:

"بھائی مہدی! تم پاپولر اخبار الہ آباد کے آرٹیکل کا ترجمہ سنو۔ وہ لکھتا ہے کہ "آج کل ہندوستان میں خاندانی مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگال میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں۔ جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا۔ اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدہ پر نہیں ہوگا۔

دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ ہی وہی کہتے ہیں۔ یہ آرٹیکل بہت بڑا ہے۔ کہیں سے دستیاب ہو تو منگا کر بالکل سنو۔ بہر حال جو عزت تم کو خدا دے وہ تمام قوم کی عزت ہے۔ اور مجھ کو دوہری خوشی ہے۔ ایک قومی، دوسری خاص محبت و محبوبیت کی۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ با اقبال رکھے۔"

مولوی امداد العلی جو سر سیّد کے سخت مخالف تھے ان کو ہندوستان میں سٹار آف انڈیا کا خطاب ملنا تجویز ہوا۔ یہ خبر سن کے مولوی مہدی علی خان لکھتے ہیں:

"بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔ ان کا یہ فرمانا کہ سیّد احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار آف انڈیا لیا اور

انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر (نہیں نہیں بھول گیا مونچھیں نہیں ہیں) داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، میرے سر اور آنکھوں پر، خدا کرے ایک ان کو اور ہزار مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔"

اول کئی خطوں میں مولوی مہدی علی خان کو اس بات کی تاکید لکھی ہے کہ میرے واپس آنے سے پہلے ایک ایسوسی ایشن مسلمانوں کی طرز معاشرت کی اصلاح کیلئے قائم کرو۔ اور ایک اخبار اسی مقصد کیلئے ایسوسی ایشن کی طرف سے ایسا اور ایسا نکالو۔ اور چنان کرو اور چنیں کرو۔ پھر جب اس سے بھی کامیابی ہوتی نہیں دیکھی تو ممانعت کر دی۔ بعد ممانعت کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

"اگر بالتخصیص مسلمانوں کی تربیت کیلئے جداگانہ مدرسہ مقرر ہو جائے تو ایک رحمت ہمارے لئے ہے۔ کوئی رات نہیں جاتی کہ ایسے مدرسہ کے تقرر کی باتیں اور تجویزیں بیان نہیں ہوتیں۔ مگر بغیر دس لاکھ روپیہ نقد کے ممکن نہیں ہے۔"

اس طرح سر سیّد کے تمام خطوں میں جو ولایت سے انہوں نے سیّد مہدی علی خان کو لکھے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کا دکھڑا رونے کے سوا کوئی مضمون نظر نہیں آتا۔

ایک تنقیدی جائزہ

سر سیّد جس زمانہ (۷۰-۱۸۶۹ء) میں انگلستان گئے تھے، وہاں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت تھی۔ سر سیّد کی آنکھیں کھلی تھیں اور ذہنی رویے کے لحاظ سے وہ آزاد خیال (Liberal) تھے۔ انہوں نے اس طرز حکومت پر یہ تبصرہ کیا:

انگلستان کی رعایا کو حقوق کی آزادی

"کسی ملک کی رعایا کو اس قدر آزادی اور اس قدر حقوق حاصل نہیں ہیں جیسے انگلستان کی رعایا کو حاصل ہیں۔ اور وہاں اگرچہ ایک بادشاہ مانا جاتا ہے لیکن اس کے اختیارات کی وہ کیفیت نہیں ہے جیسے آپ صاحبوں کے خیال میں سمائی ہوگی اور جیسے ایشیاً کے بادشاہوں کی کیفیت تھی جن کو یہ اختیار تھا کہ جس شخص کی نسبت جو حکم چاہیں دے دیں، جس کام میں جس قدر چاہیں خزانہ صرف کر دیں۔ انگلستان کے بادشاہ کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ یہاں بادشاہ کے اختیارات محدود ہیں۔ اور تمام قوانین جن پر سلطنت کی کل کارروائی منحصر ہوتی ہے، رعایا کی منظوری کے بعد جاری ہوتے ہیں، بادشاہ کو ہرگز اختیار نہیں ہے کہ سلطنت کے خزانے کو اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہے صرف کر دے۔"

(سفر نامہ، صفحہ ۲۹۱)

دلِ دردمند کی آرزو

سرسیّد نے لندن میں وہاں کے علمی اور ذہنی تحقیق کے مرکز ایتھنیئم کلب کو بھی دیکھا اور اس کی شاندار عمارت اور پر فضا علمی ماحول ہی کو نہیں ان لوگوں کو بھی دیکھا جو اس مرکز کی روح رواں تھے۔ گویا برٹش حکومت اور قوم کی اصل طاقت تھے۔ کلب کے مشاہدے اور مطالعہ کے بعد لازماً انہیں اپنی قوم یاد آئی۔ ۱۸۶۰ء کی دہائی کے اوائل میں قائم کی ہوئی علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی یاد آئی۔ اس ضمن میں سرسیّد لکھتے ہیں۔

علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کا ذکر

''ہم نے علی گڑھ سوسائٹی قائم کی، اس کیلئے ایسا عمدہ و عالیشان مکان بنایا جو اس وقت تک ہندوستان کے ہندوستانی مجمعوں کے لئے نہیں ہے۔ پھر اس سے کیا نتیجہ ہے؟ ہم وہ آدمی کہاں سے لاوئیں جو اپنے ملک، اپنی قوم کی بھلائی اور ترقی کیلئے کچھ محنت اختیار کریں۔ اس کو جانے دو۔ ہم کو تو ایسے دو چار آدمی بھی نہیں ملتے جو اس مکان میں بیٹھ کر اگر کچھ نہ کریں تو اپنی قوم کی ابتر حالت پر رو ہی دیں۔''

سوسائٹی کا باغ

''ہاں! اس مکان کا باغ ایسا عمدہ آراستہ ہے جو بہت ہی کم اپنی نظیر رکھتا ہے۔ وہ بھی کسی ہندوستانی کی سعی وکوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک فیاض و عالی ہمت اور نیک دل، نیک خصلت، فرشتہ سیرت، ہمہ تن نیکی و سرتاپا خیر مجسم یورپین لیڈی کا نتیجہ ہے جس نے اپنے شوق محنت سے اس کو آراستہ کر دیا ہے۔ ہماری قوم میں تو اتنی لیاقت نہیں ہے کہ اس پُر فضا باغ کی سیر کے بھی لائق ہوں۔ پس کسی جگہ کلب یا سوسائٹی قائم ہونے سے ہم کو کیا خوشی ہو سکتی ہے؟''

ہم وطنوں کو نصیحت

''اے ہمارے عزیز ہم وطنو! ہماری قوم کے جو لوگ بوڑھے ہیں وہ گئے دن کے ہیں، ان کو خدا جلد بہشت نصیب کرے گا۔ جو جوان ہیں، ان سے ہاتھ اٹھاؤ، جب درخت کی شاخ سخت (خشک) ہو جاتی ہے تو ٹوٹ جاتی ہے پر کسی طرف پھر نہیں سکتی۔ ہاں اپنی اولاد کی جو چھوٹی پود ہے، خبر لو، ان کی تعلیم و تربیت کی فکر کرو تمہاری حالت تمہارے باپ دادا کی حالت سے زیادہ خراب ہے۔ اور تمہاری اولاد کی حالت تم سے بہت ہی زیادہ بدتر اور ابتر ہو گی۔ اگر تم اس کی فکر نہ کرو گے، تمہاری ارواح قبر میں ان کیلئے رو دیں گی۔''

(سفرنامہ، صفحہ ۲۷۷)

بدترین مخالفوں کے ساتھ

سرسیّد اپنے مشن کے ساتھ اتنے Sincere تھے کہ ان کیلئے ذاتی دوستی اور دشمنی بے معنی ہوگئی تھی۔ خوش ہوتے تھے تو قوم کے حوالے سے اور ناخوش ہوتے تھے تو قوم کے حوالے سے۔ اس زمانے میں سرسیّد کے بدترین مخالف مولوی امداد علی تھے جو انہیں کافروں سے بدتر سمجھتے تھے۔ اور زبان وقلم سے ان کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے جب انہیں حکومت نے ''سٹار آف انڈیا'' کے تمغہ سے نوازنا چاہا اور محسن الملک نے سرسیّد کو اس امر کی اطلاع دی تو سرسیّد نے جواب میں لکھا:

''بلا تصنع میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ مولوی امداد العلی صاحب کی نسبت سٹار آف انڈیا تجویز ہونے سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ عین آرزو مسلمانوں کی ترقی اور عزت کی ہے۔ خواہ اس کو کوئی میری ضد سے حاصل کرے خواہ میرے حسد سے، خواہ مجھے ذلیل کرنے کو چشم ماروشن دل ماشاد۔ ان کا یہ فرمانا کہ سیّد احمد نے انگریزوں کا جھوٹا کھا کر سٹار آف انڈیا لیا۔ اور انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر، (نہیں نہیں بھول گیا ان کی مونچھیں نہیں ہیں) داڑھی پر ہاتھ پھیر کر، میرے سر آنکھوں پر، خدا کرے ایک ان کو اور ہزار مسلمانوں کو یہ دن نصیب ہو۔''

(مکتوب سرسیّد، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)

قومی تاریخ کے مسخ ہونے کا درد

سرسیّد نے لندن سے محسن الملک کو لکھا:

''اب ایک اور بات ضروری ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں۔ اور کوئی برائی نہیں ہے۔ جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہی کتابوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے۔ اور جو بات کہ ازراہ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو یہ صحیح اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔

چند بڑے قابل انگریز جو مسلمان ہو گئے ان کی لکھی ہوئی کتابیں نہایت تلاش سے بہم پہنچائی نہیں اور دس گنی قیمت دے کر خریدی ہیں۔ ان میں ایک کتاب ہاتھ آئی ہے جس میں اس انگریز نے نہایت خوبی سے ''یاتی من بعدی اسمہ احمد'' کے فقرہ کو ثابت کیا ہے کہ ویسی دلیلیں کسی مسلمان مولوی کے خیال میں بھی نہیں گزر سکتیں۔ علاوہ اس کے میں کیا بتاؤں کہ میں نے کیا کیا؟ اگر تم یہاں ہوتے تو شاید پھولے نہ سماتے۔''

(مکتوب سرسیّد، صفحہ ۵۴)

دل سوزی کی انتہا

سرسیّد فروری ۱۸۷۰ء میں سیّد مہدی علی، محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جنابِ من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ افسوس! کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں۔ اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں۔ امرت تھوکتے ہیں اور زہر اگلتے ہیں۔ ہائے افسوس! پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے۔ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے۔ اور علم کیوں کر آتا ہے اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا۔ مگر مجھ کافر، مردود، کفر کی کتابیں چھاپنے والے کی کون سنے گا۔ میں اپنی کتاب کا دیباچہ بھی آج لکھ چکا۔ الحمدللہ علی احسانہٗ۔ والسلام!''

خاکسار سیّد احمد

۱۱ فروری ۱۸۷۰ء، لندن

خطبات احمدیہ کی تیاری اور طباعت

سرسیّد نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیلئے تن، من، دھن کی بازی لگا دی تھی۔ صوبہ یوپی کے گورنر سر ولیم میور کی کتاب کا جواب (خطبات احمدیہ) لکھنے کیلئے انہوں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔ اس کا کچھ اندازہ اس ذاتی خط سے ہوتا ہے جو انہوں نے مولوی سیّد مہدی علی (محسن الملک) کو یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء کو لندن سے لکھا:

''پہلا خطبہ جو تیار کر رکھا ہے ایک نسخہ اس کا آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اور جب دوسرا ختم ہو جائے گا اس وقت وہ بھی بھیجوں گا۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر اس بات کی احتیاط رہے کہ اس کتاب کی تصنیف کی شہرت نہ ہو۔ اور جب تک کہ کتاب پوری نہ ہو لے اور چھپ نہ لے اس وقت تک کسی کو نہ معلوم ہو کہ ولیم میور صاحب کی کتاب کا جواب لکھا جاتا ہے۔ پس اغیار سے اس کو مخفی رکھنا چاہیے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ قبل اتمام کتاب جناب سر ولیم صاحب کو اس کا حال معلوم ہو۔ بعد اتمام انشاء اللہ تعالیٰ میں خود اپنے ہاتھ سے نذر دوں گا۔ اب بجز روپیہ کے اور کسی چیز کی فکر نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین صاحب کے پاس جایئے۔ اور میری یہ درخواست ہے کہ دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے۔ سود اور روپیہ میں ادا کروں گا۔ مگر چونکہ میں یہاں ہوں اس لئے کچھ بندوبست نہیں کر سکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کیلئے دلی لکھا ہے۔ اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ چندہ کے ذریعے سے وصول ہو جاوے تو کتاب بخوبی چھپ جاوے گی۔ میں نے میر ظہور حسین صاحب سے روپیہ چندہ کے طلب کئے ہیں۔ گو وہ کہتے ہیں کہ تنگ ہوں مگر ضرور بھیجیں گے۔ وہ میری بات سے کبھی انکار نہیں کرنے کے۔ اور سو روپیہ آپ اپنے چندہ کے بھیج دیجئے۔ اور اس خط کا جواب بلا توقف بھیجئے گا کہ ہزار روپیہ قرض کی تدبیر ہو سکی یا نہیں۔ کیونکہ اگر تدبیر نہ ہو سکے تو مجھے جلد اطلاع کرنی چاہیے۔ تاکہ میں اور فکر کروں۔ اگر یہ کتاب بعد چھپنے کے خاک میں ملا دی جاوے گی تب بھی ہزار روپیہ جو قرض لئے جاتے ہیں، وصول ہو جاویں گے۔ کیا کہئے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے۔ خدا مدد کرے۔ اگر ہندوستان سے روپیہ آنے کی مایوسی ہو جائے تو میں خود یہاں کسی بینک سے روپیہ قرض لوں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کتاب ضرور پوری کروں گا۔''

خاکسار

سیّد احمد، یکم اکتوبر ۱۸۶۹ء، لندن

چندہ لینے میں احتیاط

سرسیّد ۱۸۶۹ء میں مرزا پور، یو پی میں تعینات تھے۔ لندن سے انہیں واپس جا کر وہیں فرائض منصبی سنبھالنا تھے۔ لندن میں ان کا زیادہ وقت خطبات احمدیہ لکھنے میں صرف ہو رہا تھا، اس کی طباعت کیلئے وسائل کا مسئلہ بھی تھا۔ لندن میں اپنی مصروفیات اور کتاب کی طباعت کیلئے روپیہ کی فراہمی کے سلسلے میں سرسیّد، محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''لوگوں نے جو اخباروں میں مجھ کو بُرا بھلا لکھا اس سے آپ کو غصہ آ گیا۔ معلوم نہیں کہ آپ نے آرٹیکل میں کیا لکھا ہو گا۔ مگر مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے؟ میں تو ہدفِ تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں۔ اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید بعد میرے کوئی زمانہ آوے جب لوگ میری دلسوزی کی قدر کریں۔''

خاکسار سیّد احمد،

۲۱ جنوری ۱۸۷۰ء، لندن

رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجراء

سرسیّد نے لندن سے اکتوبر ۱۸۷۰ء میں واپس روانہ ہونے سے پہلے مولوی سیّد مہدی علی خان (محسن الملک) کو لکھا:

''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کیلئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے۔ اور ''تہذیب الاخلاق'' اس کا نام فارسی اور انگریزی میں ''محمدن سوشل رفارمر'' رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق خرید لیا ہے۔ اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہنچنے تک پہنچ جاویں گی۔ خرچ ماہوار اجراء اس اخبار کا سو روپیہ ہو گا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر کر دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے۔ اور بقیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے، اور کچھ نہیں ہونے کا۔''

سرسیّد کے نہاں خانۂ دل کی آواز

سرسیّد کی پہلی محبت ان کی اپنی قوم تھی۔ اسی کے عشق میں وہ اپنی زندگی کے آخری پچاس سال سرگرداں رہے۔ اس طرح کوئی کیا رہا ہو گا۔ اتنے طویل اور مکمل عشق کی مثال ہمیں تاریخ عالم میں مشکل سے ملے گی۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کی جو صورت حال انیسویں صدی کے اواخر میں تھی اس پر سرسیّد کے دل دردمند پر سوز قلم سے یہ الفاظ نکلے:

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم وتہذیب

''جس زمانے میں ہماری قوم کی تعلیم بھی عمدہ تھی، ہم میں بھی یہ سب خوبیاں موجود تھیں۔ اور جب سے ہماری تعلیم ناقص ہوگئی، وہ سب خوبیاں ہم میں سے جاتی رہیں۔ ہماری قوم نے ایک وقت میں علوم وفنون میں ایسی ترقی کی تھی اور ایسی فیاضی سے اپنے علوم سے یورپ کی قوموں کو نفع پہنچایا کہ بڑے بڑے مصنفوں نے اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ اگر مسلمان ان علوم میں ایسی ترقی نہ کرتے اور ان سے اور قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہنچتا جیسا پہنچا تو آج دنیا میں ان علوم وفنون کا نام بھی نہ ہوتا۔ قرطبہ کی یونیورسٹی نے اور ہماری بغداد کی یونیورسٹی نے اپنے علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے تمام دنیا میں علم کا آفتاب روشن کر دیا۔''

انگریزوں نے جو کچھ لیا، ہم سے لیا

''انگریزوں کی قوم جو آج ایسی اعلیٰ درجے کی شائستگی میں ہمارے اوپر حکومت کر رہی ہے، انہی یونیورسٹیوں اور مدرسوں سے اس کو علوم وفنون کی روشنی پہنچی۔ آج اتفاق سے ہم اور وہ قوم جس نے ایک زمانے میں ہم سے علم حاصل کیا اور ہم سے بہت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہے، ہندوستان میں جمع ہو گئے ہیں۔''

قرض کی واپسی کا مطالبہ

''پس ہمارا ان سے یہ دعویٰ ہے کہ جو قرض ان لوگوں نے ہم سے لیا تھا، وہ اب ہم ان سے وصول کریں۔ اور میں نہایت سچے دل سے شکر کرتا ہوں کہ وہ قوم اس قرض کو مع سود دینے کے لئے بڑی فیاضی سے حاضر ہے۔ یعنی جو بہت سے علوم وفنون خود اس نے اپنی محنت اور تلاش سے مستزاد کئے ہیں، وہ ہم کو سود میں دینے کیلئے حاضر ہے۔ مگر ہم اپنے تعصب اور جہالت اور نالائقی کی وجہ سے ان سے محروم ہیں۔''

اپنی قوم کی خدمت میں گزارش

''پس میری خواہش یہ ہے کہ ہماری قوم اپنے خستہ حال کو دیکھے اور جو عمدہ موقع اس کو اتفاق سے ہاتھ آیا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہ کرے اور سب ایک دل ہو کر اس میں کوشش کریں اور آپس کی ضد اور بغض اور حسد سے برباد نہ کریں۔''

(سفرنامہ، صفحہ ۲۹۱)

باب چہارم

نقشِ قدم

(جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز)

عزم صمیم

سے

ایک قوم کی تقدیر

بدلنے

کی

داستان!

ولایت سے ہندوستان

۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسیّد مع سیّد حامد کے، ولایت سے بمبئی پہنچے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنے عہدے کا چارج لیا۔ یہاں آتے ہی انہوں نے اس بڑے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کر دی جس کیلئے درحقیقت ولایت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا منصوبہ جو انہوں نے ولایت جانے سے بہت پہلے باندھا تھا اس کے پورا کرنے میں ظاہراً ان کو دو سخت مزاحمتیں نظر آتی تھیں......

اوّل، مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی تعلیم سے ان کی نفرت، اور ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔ اس مزاحمت کے دور کرنے کیلئے انہوں نے ولایت پہنچتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ سفر کے حالات اور متعدد آرٹیکل جو انہوں نے لندن سے لکھ کر بھیجے اور سوسائٹی اخبار میں شائع ہوئے، ان میں طرح طرح سے مسلمانوں کو غیرت دلائی تھی۔ اور جا بجا ان کے تنزل پر افسوس ظاہر کیا تھا۔ اور انگریزی تعلیم کی ضرورت بیان کی تھی۔ لیکن ان تحریروں کا اثر مسلمانوں پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔

دوسری مزاحمت ان کو یہ معلوم ہوتی تھی کہ ان کا ارادہ فی الواقع ہندوستان پہنچ کر محمڈن یونیورسٹی قائم کرنے کا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کی موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں حقیقی لیاقت پیدا ہونے کی ان کو ہرگز امید نہیں تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کیلئے ناکافی اور ہندوستان کے ایجوکیشنل سسٹم کو غیر مفید قرار دیا جائے۔ چنانچہ اسی بناً پر انہوں نے ولایت میں ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا تھا، جس کا عنوان تھا، 'ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراضات' ان دونوں رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے انہوں نے ہندوستان پہنچ کر دو بڑے بڑے کام ایک ساتھ شروع کئے۔

تہذیب الاخلاق کا اجراء

اول مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی خیالات کی اصلاح اور ان کو ترقی کی طرف مائل کرنے کیلئے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو اس کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ اس رسالہ کی پذیرائی بھی ہوئی۔ لیکن قدامت پسند طبقے نے اس کی سخت مخالفت کی اور ان کو نیچری، کرسٹان، سب کچھ کہا۔ بہ ایں ہمہ سرسیّد نے خلوص دل سے اپنا اصلاحی مشن جاری رکھا۔ اس پرچے کی حیثیت اس زمانے کے الجھے ہوئے تاریخی معاشرتی اور ذہنی افق پر ایک روشن ستارے کی سی تھی۔

کمیٹی خواستگار ترقی، ترقی وتعلیم مسلماناں

''تہذیب الاخلاق'' ہی کے ساتھ سرسیّد نے دوسرا یہ کام کیا کہ انہوں نے بنارس ہی میں ایک کمیٹی بنام کمیٹی خواستگار، ترقی وتعلیم مسلماناں قائم کی۔ اور اس کیلئے سب سے پہلے خود چندہ دیا۔

(حیات جاوید، صفحہ ۱٦٦)

دل دردمند کے آنسو

سرسیّد کی بنائی ہوئی کمیٹی خواستگار ترقی وتعلیم مسلماناں کا پہلا اجلاس ۲٦ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بنارس میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں شرکت کیلئے سرسیّد کی دعوت پر نواب محسن الملک ایک روز قبل ۲۵ دسمبر کی شام ہی کو بنارس پہنچ گئے تھے۔ رات کو سرسیّد نے ان کا پلنگ اپنے ہی کمرہ میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بارہ بجے تک دونوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

اس کے بعد محسن الملک کی آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے سرسیّد کو اپنے پلنگ پر نہ پایا جوان کو دیکھنے کو کمرہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ سرسیّد برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں اور زار وقطار روتے جاتے ہیں۔

محسن الملک: (گھبرا کر) کیا خدانخواستہ کہیں سے افسوسناک خبر آئی ہے؟

سرسیّد: (اور زیادہ رو کر) اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے۔ اور بگڑتے جاتے ہیں۔ اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔

محسن الملک: آپ دلبرداشتہ نہ ہوں۔

سرسیّد: کیوں نہ ہوں۔ جو جلسہ کل ہونے والا ہے مجھے اُمید نہیں کہ اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو۔ ساری رات اسی ادھیڑ بُن میں گزر گئی۔ دیکھئے کل کے جلسے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اور کسی کے کان پر جوں چلتی ہے کہ نہیں۔

محسن الملک یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اپنے خطے میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد کی حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کرسکتا۔ اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کو میں ہی جانتا ہوں۔''

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۱٦۹)

علی گڑھ کالج قائم کرنے کی اصل غایت

حالی: قبلہ، سیّد صاحب! علی گڑھ کالج مدرستہ العلوم قائم کرتے وقت آپ کے ذہن میں مستقبل کی تصویر کیا تھی؟

سرسیّد: بنیادی طور پر ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا یہ جواب آیا کہ کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے میرا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا تب تک اصلی لیاقت قوم بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلوسسٹم جاری کیا جائے۔ اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں، جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کیلئے فیلوشپ دی جایا کرے۔ اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کیلئے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی، کوئی اس بات پر رضا مند ہونے والا نہ تھا کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں، قطع نظر کی جائے۔ اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض مجھے اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال میں نے بالکل چھوڑ دیا۔ اور مدرستہ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی۔

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

(حیات جاوید، صفحہ ۱۹۰)

اسلام پر یقین کی نوعیت

سرسیّد کے ایک دوست انگلستان جانے لگے تو کچھ تشکیک کا شکار تھے۔

دوست: انگلستان کا قصد تو کر رہا ہوں لیکن کچھ تردد بھی ہے۔

سرسیّد: کیا؟

دوست: کہیں اسلام سے دور نہ ہو جاؤں۔

سرسیّد: تم تشکیک کا شکار کس طرح ہوئے؟ میں خود اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا، بلکہ اسلام پر میرا یقین میری ذاتی تحقیق پر ہے۔ میں اپنی تحقیق سے نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں۔ اس قدر یقین آپ کے بڑے بڑے مدعیان اسلام کو نہ ہوگا جتنا مجھے ہے۔ خدا نے مجھے ہدایت دی اور تقلید کی گمراہی سے نکالا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح خصوصاً مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اٹھایا تو انہیں مذہبی مسائل اور مذہبی تحقیق کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی پڑی۔ کیونکہ ان کی تحریک کے خلاف سارے ملک میں مخالفتوں کا جو زبردست طوفان اٹھا تھا اور اعتراضات کا جو بوچھاڑ ہر طرف سے ہوئی وہ سب مذہب کی بنیاد پر تھی۔ علاوہ اس کے عیسائی مشنریوں اور یورپی مصنفوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت اور پیغمبر ﷺ کی سیرت پر پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ارکان نے اسلام کو فساد و بغاوت کا بانی مبانی قرار دے رکھا تھا۔ اور یہ بات ان کے دل میں جاگزیں تھی کہ مسلمان ازروئے مذہب حکومت انگریزی سے بدخواہی اور بغاوت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان سب آفتوں سے بڑھ کر ایک آفت یہ تھی کہ قوم کے نوجوان، جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی تعلیم پا رہے تھے وہ مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ روایتی مولوی صاحبان ان کی کتابوں اور مناظرے سے تشفی نہیں کر سکتے تھے۔ سرسیّد نے بڑی دلیری، جرأت اور کمال تحقیق اور محبت سے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کیلئے انہیں ایک نیا علم الکلام وضع کرنا پڑا۔ یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری کی جس میں اسلام اور رسول ﷺ کی سیرت پر سخت اعتراضات کئے گئے تھے۔ ہندوستان میں کافی تحقیقی مواد میسر نہ آیا تو لندن کا سفر کیا۔ اور وہاں کے کتب خانوں اور دوسرے ذرائع سے کتابیں مہیا کیں۔ اس جوابی کتاب (خطبات احمدیہ) کی تیاری اور طباعت کے مصارف اس قدر بڑھ گئے کہ انہیں اپنا کتب خانہ اور گھریلو سامان وغیرہ فروخت کرنا پڑا۔ قرض لیا اور دوستوں سے روپیہ جمع کیا اور شب و روز کی محنت شاقہ اٹھا کر ایسا مدلل جواب لکھا کہ مخالف بھی مان گئے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کیلئے بے شمار مضامین لکھے اور قرآن کی تفسیر بھی اس نیت سے لکھنی شروع کی۔ تحقیق اور اجتہاد میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اسے توڑا۔ اور بہت سے مسائل کی الجھنوں کو سلجھایا۔ غرض اسلام کی وہ بے نظیر خدمت کی جو کسی دوسرے سے نہ بن آئی۔

سرسیّد: بنیادی طور پر ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج ہی قائم کرنا نہیں تھا بلکہ یونیورسٹی قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس سکیم کی جو کاپی گورنمنٹ میں بھیجی گئی تھی اس میں بھی یونیورسٹی کا لفظ لکھا تھا۔ لوکل گورنمنٹ سے اس کا یہ جواب آیا کہ کمیٹی محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو گورنمنٹ اس میں گرانٹ ان ایڈ نہیں دینے کی۔ باوجود اس کے میرا ارادہ یہی تھا کہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ مجھے یقین تھا کہ جب تک موجودہ یونیورسٹیوں کی تعلیم سے قطع نظر نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ان کی ضرورتوں کے موافق تعلیم و تربیت کا اپنے طور پر انتظام نہ کیا جائے گا تب تک اصلی لیاقت قوم بچوں میں ہرگز پیدا نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلوسسٹم جاری کیا جائے۔ اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں، جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کیلئے فیلوشپ دی جایا کرے۔ اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کیلئے بمنزلہ آلہ کے ہو۔ لیکن قطع نظر اس کے کہ ایسی یونیورسٹی صرف قوم کے بھروسے پر قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، نہ طالب علم اور نہ ان کے مربی، کوئی اس بات پر رضا مند ہونے والا نہ تھا کہ یونیورسٹی کی ڈگریوں سے جو گورنمنٹ کی نوکری کا ذریعہ ہیں، قطع نظر کی جائے۔ اور فی الحقیقت مسلمانوں کی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ صرف موجودہ یونیورسٹیوں کی ڈگریاں حاصل کرنے ہی کو فوز عظیم سمجھا جائے۔ الغرض مجھے اپنا منصوبہ پورا کرنے سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال میں نے بالکل چھوڑ دیا۔ اور مدرستہ العلوم میں وہی کورس اختیار کرنا پڑا جو موجودہ یونیورسٹیاں تجویز کریں۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی۔

نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

(حیات جاوید، صفحہ ۱۹۰)

اسلام پر یقین کی نوعیت

سرسیّد کے ایک دوست انگلستان جانے لگے تو کچھ تشکیک کا شکار تھے۔

دوست: انگلستان کا قصد تو کر رہا ہوں لیکن کچھ تردد بھی ہے۔

سرسیّد: کیا؟

دوست: کہیں اسلام سے دور نہ ہو جاؤں۔

سرسیّد: تم تشکیک کا شکار کس طرح ہوئے؟ میں خود اس لئے مسلمان نہیں ہوں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا، بلکہ اسلام پر میرا یقین میری ذاتی تحقیق پر ہے۔ میں اپنی تحقیق سے نہ تقلید سے، دین اسلام کو حق سمجھتا ہوں۔ اس قدر یقین آپ کے بڑے بڑے مدعیان اسلام کو نہ ہوگا جتنا مجھے ہے۔ خدا نے مجھے ہدایت دی اور تقلید کی گمراہی سے نکالا۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے۔ جب انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح خصوصاً مغربی تعلیم کی ترویج کا بیڑا اٹھایا تو انہیں مذہبی مسائل اور مذہبی تحقیق کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی پڑی۔ کیونکہ ان کی تحریک کے خلاف سارے ملک میں مخالفتوں کا جو زبردست طوفان اٹھا تھا اور اعتراضات کا جو بوچھاڑ ہر طرف سے ہوئی وہ سب مذہب کی بنیاد پر تھی۔ علاوہ اس کے عیسائی مشنریوں اور یورپی مصنفوں کی طرف سے اسلام کی حقانیت اور پیغمبر ﷺ کی سیرت پر پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے ارکان نے اسلام کو فساد و بغاوت کا بانی مبانی قرار دے رکھا تھا۔ اور یہ بات ان کے دل میں جاگزیں تھی کہ مسلمان ازروئے مذہب حکومت انگریزی سے بدخواہی اور بغاوت کرنے پر مجبور ہیں۔ ان سب آفتوں سے بڑھ کر ایک آفت یہ تھی کہ قوم کے نوجوان، جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی تعلیم پا رہے تھے وہ مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے تھے۔ روایتی مولوی صاحبان ان کی کتابوں اور مناظرے سے تشفی نہیں کر سکتے تھے۔ سرسیّد نے بڑی دلیری، جرأت اور کمال تحقیق اور محبت سے ان تمام خطروں کا مقابلہ کیا اور اس مقابلے کیلئے انہیں ایک نیا علم الکلام وضع کرنا پڑا۔ یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے۔

سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے کی تیاری کی جس میں اسلام اور رسول ﷺ کی سیرت پر سخت اعتراضات کئے گئے تھے۔ ہندوستان میں کافی تحقیقی مواد میسر نہ آیا تو لندن کا سفر کیا۔ اور وہاں کے کتب خانوں اور دوسرے ذرائع سے کتابیں مہیا کیں۔ اس جوابی کتاب (خطبات احمدیہ) کی تیاری اور طباعت کے مصارف اس قدر بڑھ گئے کہ انہیں اپنا کتب خانہ اور گھریلو سامان وغیرہ فروخت کرنا پڑا۔ قرض لیا اور دوستوں سے روپیہ جمع کیا اور شب و روز کی محنت شاقہ اٹھا کر ایسا مدلل جواب لکھا کہ مخالف بھی مان گئے۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے شکوک رفع کرنے کیلئے بے شمار مضامین لکھے اور قرآن کی تفسیر بھی اس نیت سے لکھنی شروع کی۔ تحقیق اور اجتہاد میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا اسے توڑا۔ اور بہت سے مسائل کی الجھنوں کو سلجھایا۔ غرض اسلام کی وہ بے نظیر خدمت کی جو کسی دوسرے سے نہ بن آئی۔

سرسیّد کی رائے اور اجتہاد میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی۔ لیکن ان کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم وفضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں لیکن ان کا دائرہ عمل ایک یا دو مہمات تک محدود تھا۔ ایسا جامع صفات، بے لوث و بے نفس، پرعزم و استقلال، سراپا خلوص وصداقت اور ایثار، مصلح، برصغیر کے مسلمانوں کو اس سے پہلے اور اس کے بعد نصیب نہ ہوا۔ انہوں نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اور ایسا قومی جذبہ پیدا کیا جواب تک کام کر رہا ہے۔

حق یہ ہے کہ مسلم قومیت کا خیال بھی سرسیّد ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اگر سرسیّد کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا قلعہ پاکستان کی بنیاد میں سب سے پہلی اینٹ اسی پیر مرد نے رکھی تھی۔

سرسیّد کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ وہ مجاہد عمر بھر، تا آخر اسی دھن میں لگا رہا اور مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دنیا سے چل بسا۔ قوم کے اس عظیم محسن کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو۔ جب مرا تو کفن کیلئے پیسہ نہ نکلا۔ غیروں نے اپنے خرچ سے تجہیز وتکفین کی۔ یہ ہے خدا کے مقبول بندوں کی شان۔''

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۸۶)

ازخود نماز نہ پڑھنا گناہ اور کسی کے منع کرنے پر نہ پڑھنا کفر

سرسیّد کے ایک عزیز دوست تھے مولوی مشتاق حسین، جو یوپی کے محکمہ مال میں سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے سرسیّد سے مشورہ کیا۔

مشتاق حسین: قبلہ! ان دنوں شدید ذہنی دباؤ میں ہوں۔ آیا کیا کروں، کیا نہ کروں۔

سرسیّد: ایسا کیا مسئلہ ہے؟

مشتاق حسین: میرا انگریز افسر دفتری اوقات میں میرے نماز پڑھنے پر معترض ہوتا ہے۔

سرسیّد: پھر تم نے کیا کیا؟

مشتاق حسین: میں نے افسر کو رام کرنے کی بڑی کوشش کی۔

سرسیّد: کیسے؟

مشتاق حسین: میں نے کہا، حضور رخصت ہی دے دیں، تنخواہ کاٹ لیں۔

سرسیّد: بھائی، نماز کے سلسلہ میں وقت بے وقت میں بھی خیال نہیں کرتا۔ دو دو اکٹھی بھی پڑھ لیتا ہوں۔ ریل میں جتنا سفر ہو مجھ سے ادا نہیں ہوسکتی۔ یہ باتیں مجھ میں ہیں۔ اور نالائقی اور

شامت اعمال ایسی سستی نماز میں ہے۔ مگر تم نے اس معاملہ میں، جو پیش آیا، نہایت لچر پنا کیا۔ نماز جو خدا کا فرض ہے، اس کو اپنی شامت اعمال سے جس خرابی سے ہو، ادا کریں یا قضا کریں۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نماز نہ پڑھو، اس کا صبر ایک لحہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات سنی بھی نہیں جا سکتی۔ میری سمجھ میں نماز نہ پڑھنا صرف گناہ ہے۔ جس کے بخشے جانے کی توقع ہے۔ اور کسی شخص کے منع کرنے سے نہ پڑھنا یا سستی میں ڈالنا میری سمجھ میں کفر ہے، جو کبھی بخشا نہ جائے گا۔ تم کو یا تو پہلے خود اپنی شامت اعمال سے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جو کبھی اس قسم کی بحث کی نوبت نہ آتی۔ اور جب ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا تو پھر لجلجانا اور گڑگڑانا کہ حضور رخصت ہی دے دیں، تنخواہ کاٹ لیں، واہیات تھا۔ تڑاق سے استعفیٰ دے دینا تھا۔ صاف کہہ دینا تھا کہ میں اپنے خدائے عظیم الشان قادر مطلق کے حکم کی تعمیل کروں گا، نہ آپ کی۔ کیا ہوتا؟ نوکری نہ میسر ہوتی؟ فاقے کرتے، مر جاتے، نہایت اچھا ہوتا!

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۸)

مسلمانوں کی تعلیم کیسی ہو؟

۱۸۷۴ء میں لاہور کے مقام پر سرسیّد نے ایک تاریخی لیکچر میں، جس سے ان کے تعلیمی نظریات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے، کہا:

''اے صاحبو! میں اوپر ثابت کر آیا ہوں کہ عمدہ تعلیم و تربیت ہی قومی عزت اور قومی ترقی کا اصلی ذریعہ ہے۔ مگر کوئی قوم عزت نہیں پا سکتی جب تک تعلیم ایک مقدار مناسب سے اس میں رائج نہ ہو اور اس مقدار مناسب کا اندازہ حسب تفصیل ذیل ہو سکتا ہے۔ یعنی ضرور ہے کہ اس قوم میں ایک گروہ معتدبہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایسا ہو جس میں سے کوئی کسی علم میں اور کوئی کسی علم میں دستگاہ کامل رکھتا ہو اور اس طرح تمام علوم کے کامل لوگ اس قوم میں موجود ہوں جن کی عقل و فہم و سعی و کاوش سے علم کو روز بروز ترقی ہو۔ اور جن کے نام سے ہماری عزت و فخر ہو اور پھر ان لوگوں کی تعداد بھی ایسی ہو جن پر اطلاق النادر کالمعدوم کا نہ ہو۔

اس کے بعد ایک گروہ متوسط درجہ کی تعلیم کا اس قوم میں ہونا چاہیے جو عالی رتبہ مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتا ہو اور ہر ایک دقیق اور باریک اصول سے بخوبی واقف ہو اور تعلیم کے ذریعہ سے وہ سب باتیں اپنی قوم کو سکھا سکتا ہو۔ اس گروہ کی تعداد ایسی ہونی چاہیے کہ بلحاظ قومی تعداد کے، ایک مناسب مناسبت رکھتی ہو۔ اس کے بعد ادنیٰ درجہ تعلیم کا ہے۔ مگر اس میں بھی تین قسم کے گروہوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک گروہ ایسا ہو جو کل قوم سے تعداد میں ایک مناسبت معقول رکھتا ہو۔ اور اس نے اس قدر تعلیم پائی ہو کہ خاص اپنے عقل و علم سے اپنے کاموں کو انجام دے سکے۔ اس کے بعد اس درجہ کے ایسے لوگ بہ تعداد کثیر ہونے چاہئیں جو اپنے دنیوی ضروری کاموں کا انجام بخوبی تمام کر سکتے ہوں اور چونکہ یہ لوگ محض جاہل نہیں ہونے کے تو ضرور ان میں اس قدر علم کی روشنی ہوگی کہ جو ترقیاں علوم و فنون میں ہر روز ہوتی جاتی ہیں اس کے وسیلہ سے ان سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جو جسمانی محنت کرنے کی لیاقت رکھتے ہوں۔ ان میں بھی اس قدر استعداد ہونی چاہیے کہ آسان آسان کتابیں اور سہل سہل چھوٹے چھوٹے اخبار اور مذہبی مسائل کی کتابیں پڑھ سکتے ہوں، تھوڑ بہت اپنا مطلب لکھ سکتے ہوں، حساب

کر سکتے ہوں۔ مگر مسلمانوں کی تعلیم کا حال اور قوموں کی تعلیم سے جو ہندوستان میں آباد ہیں، بالکل مختلف ہے۔ ان کا مذہب، ان کی مذہبی تعلیم عام تعلیم سے ایسا ملا ہوا ہے جیسے جسم و جان۔ جب اس کو علیحدہ کیا جائے گا، جسم بے جان رہ جائے گا۔ برخلاف ہندوستان کی اور قوموں کے کہ ان کے یہاں مذہبی تعلیم عام تعلیم سے بالکل علیحدہ ہے۔''

غرض سرسیّد کے نزدیک مذہبی تعلیم کا منتہائے نظریہ تھا کہ:

''ہماری تعلیم اس وقت ہو گی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔ یونیورسٹی کی غلامی سے آزادی ہو گی۔ ہم آپ اپنی قوم میں علوم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں۔ اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر ہوگا۔''

تربیت کے متعلق اپنے نظریہ کو سرسیّد نے ایک تقریر میں بیان کیا کہ:

''اگلے زمانے میں تعلیم کی صورت دوسری تھی۔ اور تعلیم کے اخراجات بہت قلیل تھے۔ طالب علم مسجدوں یا خانقاہوں کے حجروں میں رہتے تھے۔ ان کی ایک وقت کی روٹی کسی گھر سے اور دوسرے وقت کا کھانا کسی گھر سے ملتا تھا۔ مردوں کے فاتحہ روٹی، سوئم اور چہلم کے کھانے پر ان کی گزران تھی۔ کہیں لنگر جاری تھا۔ اور وہ ہی ذریعہ ان کی گزران کا تھا۔ جن لوگوں کی عمر میرے برابر یا مجھ سے زیادہ ہے یا جن لوگوں نے مصر کی سیر کی ہے اور جامع ازہر کے مدرسہ اور طالب علموں کو دیکھا ہے انہوں نے یہ سب باتیں اپنی آنکھ سے دیکھی ہوں گی۔ ہندوستان میں اب بھی اسلامی مدرسوں میں اس کا نشان پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کے طالب علموں کو پہننے کیلئے ایک کرتہ اور ایک پاجامہ اور زیادہ سے زیادہ تکلف ہوا تو ایک لنگی کافی تھی۔ میرا مطلب اس بیان سے ان کی تحقیر کرنا نہیں کیونکہ ان طالبعلموں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جو نہایت مقدس اور قابل ادب ہیں۔ بلکہ میرا مطلب اس بیان سے ایک امر واقعی بیان کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اس زمانہ میں وہ سادہ اور کم خرچ طریقہ علوم تحصیل کرنے کا نہیں چل سکتا۔ خصوصاً علوم انگریزی اس طرح حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور نہ وہ اوصاف طالب علموں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کا پیدا ہونا بہ مقتضیات زمانہ ہم ان میں چاہتے ہیں۔ اور نہ اپنے طریقہ تعلیم و تربیت سے ان میں ہمت و جرأت اور سیلف رسپکٹ پیدا ہوسکتی ہے۔ نہ غیرت وحمیت باقی رہ سکتی ہے۔ نہ ان میں قومی ہمدردی کا جوش پیدا ہوتا ہے نہ قوم کو ان سے قومی بہبود کی توقع ہوسکتی ہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ جلوہ تھا وہ صرف ایسی سلطنت کا تھا جو انہی کی ہم خیال تھی جو مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے

یا تعلیم پاتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں سلطنت کا، قوموں کا، قوموں کی ترقی و بہبودی کا اور علم کا اور قوم کے غریبوں کی مدد کرنے کا سب رنگ بدل گیا ہے۔ اور جب تک ہم بھی نہ بدل جائیں اور زمانہ کے ساتھ نہ چلیں کسی طرح کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

اس زمانہ میں بھی مسلمان طالب علم اور شریف خاندانوں کے بچے بہت زیادہ امداد کے محتاج ہیں۔ قوم کی سرداروں، قوم کے مالداروں اور قوم کے ترقی خواہوں کو ان کی امداد کرنی ضرور ہے مگر نہ اس پہلے طریقہ سے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ بلکہ دوسرے طریقہ سے جس سے ان طالب علموں کی حمیت و غیرت، سیلف رسپکٹ میں بھی خلل نہ آئے اور ان کی تعلیم میں بھی مدد ملے۔ وہ شریفانہ طریقہ پر رکھے جائیں۔ تا کہ ان کی حمیت و غیرت اور اپنے بھروسہ کرنے کی خصلت کو روز بروز ترقی ہوتی جائے جو آئندہ کو قومی ترقی اور بہبود کا ذریعہ ہے۔''

تربیت کے طریقوں کو سرسیّد نے ایک اور تقریر میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا کہ:

''سب سے اول ہمارا مقصد ہے کہ مسلمانوں میں نیشنلٹی یعنی قومیت اور قومی اتحاد اور قومی ہمدردی جو اول سیڑھی قومی ترقی کی ہے، قائم رہے۔ اس کیلئے ہم کو کیا کرنا ہے؟ سب سے مقدم یہ کرنا ہے کہ وہ مسلمان رہیں اور مذہب اسلام کی حقیقت ان کے دل میں قائم رہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم انگریزی تعلیم کے ساتھ ان کو مذہبی تعلیم بھی دیں اور عقائد مذہبی ان کو سکھا دیں اور جہاں تک ممکن ہو ان کو فرائض مذہبی کا پابند رکھیں۔ تاریخ اسلام اور مذہب اسلام کے شیوع سے، جس کے سبب کل جزیرہ عرب کے باشندے لاالہٰ الا اللہ محمد رسول اللہ بول اٹھے، ان کو آگاہ کریں۔ اس کے بعد ان کو اخوت اسلامی کا سبق دیں، بتلا دیں کہ اخوت اسلامی کیا چیز ہے جو نسبی اخوت سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔ اس اخوت میں کیا خوبی اور عمدگی اور تمام اخوتوں پر تفوق تھا جس کے سبب سے خدا نے اپنا احسان ہم پر جتایا اور فرمایا کہا

الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعاً

ما الفت بین قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم

پھر ہم کو اپنی قومیت قائم رکھنے کیلئے عربی زبان کی بھی، جو ہمارے بزرگوں اور ہمارے پاک مذہب کی زبان ہے، جس قدر ہو سکے تعلیم دینا ہے۔ کم سے کم یہ کہ فارسی زبان ہی سکھا دیں تا کہ قومیت کا اثر ان میں پایا جائے۔ انگریزی تعلیم کے سبب ان میں سے قومیت معدوم نہ ہونے پائے۔ پھر ہم کو ان میں قومی ہمدردی پیدا کرنی ہے۔ قومی ہمدردی کا پیدا ہونا بجز اس کے کہ غول کے غول مسلمان بچوں کو ہم ایک جگہ جمع کریں، وہ سب مل کر ایک جگہ رہیں،

ایک جگہ نماز پڑھیں اور ایک ساتھ کھائیں، ناممکن ہے۔ اس مطلب کیلئے ہم کو بورڈنگ ہاؤس بنانا ہے جس میں کم سے کم ایک ہزار بچے کالج کلاسوں میں رہ سکیں۔ ان میں باہمی اخوت ہو اور ماں جائی بھائی بندی ان میں پیدا ہو۔ اگر ہم نے اپنے بچوں میں اس طرح اخوت اور قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہ کیا تو آپ جانتے ہیں کہ نہ تو قوم قوم بن سکتی ہے اور نہ قوم کو ترقی ہوسکتی ہے اور نہ قوم کو قومی عزت کا درجہ حاصل ہوسکتا ہے۔

پھر ہمیں ان کو اس طرح پرکھنا ہے کہ وہ مردہ دل نہ ہونے پائیں۔ اور ان کی دلی امنگیں ٹھنڈی نہ پڑنے پائیں۔ ان کی جرأت و ہمت کسی کام کرنے کی گھٹنے نہ پائے بلکہ روز بروز بڑھتی جائے۔ اس مطلب کیلئے اور ان کی صحت جسمانی قائم رکھنے کیلئے ہم کو ان کیلئے کھیلوں اور جسمانی ورزشوں کا سامان مہیا کرنا ہے۔ تاکہ جو ضعیف القویٰ ہیں ان کی صحت محفوظ رہے اور جو طاقتور ہیں ان میں زیادہ طاقت آئے۔ ان کی ترقی تعلیم کیلئے سوسائٹیاں اور کلب قائم کرنے ہیں جن میں ان کو اپنی علمی ورزش کا موقع ملے۔

پھر ہم کو ان کے اخلاق کی درستی پر متوجہ ہونا ہے۔ اور ان میں نیکی اور راست بازی، سچائی اور دوستوں سے سچی دوستی کی فیلنگ پیدا کرنی ہے۔ اس مقصد کیلئے ہم کو نصیحت سے زیادہ ان کے گرد ایسے اسباب پیدا کرنے ہیں اور ان کے آس پاس ایسے بزرگوں اور نیک لوگوں کا جمع کرنا ہے جن کے سبب سے اور جن کی صحبت سے ان کی طبیعت نیکی اور نیک دلی کی طرف مائل ہو اور گویا اخلاق حمیدہ ان کی طبع ثانیہ ہو جائے۔

اے عزیزو! تعلیم، اگر اس کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بن سکے، وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی اے اور ایم اے ہو جانا جب تک اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو، ہم قوم کو قوم۔ اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔ اسلام نے اس قومیت کے بدلے جو نسل یا ملک کے سبب سے گنی جاتی ہے، اسلامی قومیت قائم کی ہے جس نے کلمہ پڑھا خواہ وہ چین کا رہنے والا ہو یا عرب کا رہنے والا ہو، یا ہندوستان کا، سب آپس میں بھائی اور مسلمان ہیں اور قوم اسلام۔ اور یہ ایسا افتخار ہے کہ سوائے اسلام کے اور کسی میں پایا نہیں جاتا۔ پس ہم کو اس بات کی فکر ہے کہ ہماری قوم، قوم بنے اور معزز قوم!''

(حیات جاوید، صفحہ ۵۹)

اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کا نظریہ

سرسیّد نے مئی ۱۸۷۵ء میں کالج قائم ہونے کے بعد کانفرنس کی ایک تقریر میں اعلیٰ تعلیم اور اس کے ذریعہ عام تعلیم کی اشاعت کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا:

''میں اپنی قوم کو آسمان کے مانند دیکھنا چاہتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کی جو نیلا یا سیاہ رو ڈراؤنا ہم کو دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ مگر ان ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس میں چمک رہے ہیں اور معشوقانہ انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جن کے سبب سے اس سیاہ رو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم کے ایسے لوگ پیدا کئے بغیر جو تمہاری قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوم کی آنکھوں میں باعزت بنا سکتے ہو؟ ہر گز نہیں!!! اے صاحبو! کیا تم ان ستاروں کو پیدا کئے بغیر اپنی سیاہ رُو، درماندہ، ذلیل قوم میں کوئی خوبی پیدا کر سکتے ہو؟ عام تعلیم کا عام لوگوں میں، بغیر موجود ہونے اعلیٰ تعلیم کے، پھیلنا ناممکن ہے اور تمام دنیا کی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔''

معیار قابلیت کے متعلق بھی اسی اجلاس میں جو وظائف کے متعلق ریزولیشن پر تقریر کی، اس میں کہا کہ:

''اے صاحبو! یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جس کو ہم بی اے یا ایم اے تک پڑھا لیں گے وہ قابل بھی ہی ہو جائے گا، کمہار کے آوے میں سب برتن پکے ہوئے ہی نہیں نکلتے۔

اس زمانہ میں ہندوستان کی قوموں میں جو قوم برآوردہ ہے اور جو سب کی سرتاج ہونے کی دعویدار ہے وہ ہمارے ہموطن بھائی بنگالی ہیں۔ ان کو دیکھو، ان میں ہزاروں بی اے اور ایم اے ہیں۔ مگر باوجود اس کثرت کے ان میں بھی معدودے چند ہیں جو قابلیت اور لیاقت وفضیلت کا ڈنکا بجانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ پس ہم اگر اپنی قوم کے سینکڑوں طالب علموں کو اس طرح تعلیم دے کر قابل بنا دیں گے جس طرح کہ میرے دوست مسٹر بیک نے کہا ہے تو ان میں چند ایسے نکلیں گے جو قوم کے لئے باعث اعزاز ہوں۔ اگر ہم، فیصد دس دس تو بہت زیادہ ہیں، فیصد پانچ پانچ بھی ایسے لائق پیدا کر لیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہم نے آسمان کے تارے توڑ لئے۔''

پھر ۱۸۹۸ء میں ایک مضمون کے دوران زور دیا کہ:

''جب تک مسلمانوں میں کافی سے زیادہ اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم نہ ہوئی اس وقت تک کوئی معتد بہ فائدہ دنیاوی، اور بعض حالتوں میں دینی بھی، نہ ہوگا۔ مسلمانوں میں ڈگری پانے والوں کی تعداد اس قدر کثرت سے ہونی چاہیے کہ اگر کوئی شخص زمین پر سے ڈھیلا اٹھائے تو وہ بھی گریجویٹ ہو۔ اس قدر بیان کرنے پر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمانوں کو جو انگریزی تعلیم پاتے ہیں ایک خاص سٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ زندگی کے خاص سٹینڈرڈ تک پہنچنے کے بعد آئندہ کے واسطے کیا بہتر ہوگا؟

اس کے جواب میں وہی جواب دینا مناسب ہے جو ایک دانا دہقان نے اپنے نوجوان بیٹے کو دیا تھا۔ ایک دہقان کے بیٹے نے بہت اضطراب سے اپنے باپ سے کہا کہ گاؤں کے تالاب میں پانی چلا آتا ہے۔ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی کہاں جائے گا؟ اس کے باپ نے کہا کہ بیٹے! اندیشہ مت کرو۔ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی اپنے نکلنے کا آپ راستہ نکالے گا۔

یہی حال تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ہے۔ ابھی ان کے ایسی قلت ہے کہ وہ کوئی راستہ زندگی کے واسطے نہیں نکال سکتے۔ ہاں، جب کثرت سے ہوں گے تو کوئی راستہ نکالیں گے۔ راستوں کی کمی نہیں۔ مگر ابھی تو تالاب بھرا نہیں ہے۔''

سرسیّد کے شب و روز

۱۸۸۵ء میں سرسیّد کی پہلی باقاعدہ سوانح حیات کرنل گریہم نے لکھی تھی گریہم سرسیّد کے شب و روز کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد اب کئی سال سے علی گڑھ میں اپنے آرام دہ مکان میں رہتے ہیں۔ یہ مکان ان کے لئے بیٹے سیّد محمود نے خرید کیا اور اس کو یورپین طرز پر سجایا ہے۔ یہاں پر وہ اپنے بے شمار دوستوں کی خاطر مدارت کرتے ہیں، جن میں مسلمان، سکھ، ہندو اور انگریز سب شامل ہیں۔ اور یہ دوست ہندوستان کے ہر حصہ سے ان کے پاس آتے ہیں۔ اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس پر ادبی ماحول چھایا ہوا ہے۔

اس کے بیٹھنے کے کمرہ میں جہاں وہ دن کا زیادہ حصہ گزارتے ہیں، ایک میز ہے جو کتابوں اور کاغذوں سے لدی ہوئی ہے۔ ان کے کھانے کے کمرہ میں دیواروں کے ساتھ ساتھ کتابوں کی الماریاں لگی ہیں۔ جن میں معیاری انگریزی کتابیں ہیں۔ ان کی ایک لائبریری بھی ہے جس کا کمرہ بہت شاندار ہے۔ اس میں انواع و اقسام کی مگر زیادہ تر مذہبی کتابیں ہیں۔ جن کی مدد سے انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر اور شرح انجیل لکھی ہے۔ ان میں ایک

کتاب سیّد محمود کا وہ مضمون بھی ہے جس پر ان کو کیمبرج یونیورسٹی میں انعام ملا تھا۔ ان کے گول کمرہ میں وہ ڈپلوما لگا ہوا ہے جو ان کو فیلو آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی ہونے پر ملا۔ اور اس پر ان کو بہت ناز بھی ہے۔ دیوار پر ان کے دوست سر سجان اسٹریچی کی ایک قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ علاوہ اس کے دیگر تصاویر سر سالار جنگ لارڈ لٹن اور ہز ہائی نس نظام حیدر آباد کی آویزاں ہیں۔ ان کے دن خوشگواری سے گزرتے ہیں۔

ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ان تھک قوت و طاقت ہے۔ علاوہ قومی اہمیت کے مسائل پر وسیع النظری کے، ان میں کام کرنے کی ایک خاص طاقت ہے کہ کام کے متعلق وہ باریک سے باریک تفصیل بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ صبح چار بجے اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے اخباری آرٹیکل لکھتے ہیں یا کتابوں اور پمفلٹوں وغیرہ کی تصنیف کرتے ہیں پھر آنے والوں سے ملتے ہیں جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کالج کمیٹیوں کی معتمدی کے فرائض بھی ادا کرتے ہیں جو نہ صرف دن تک محدود رہتے ہیں بلکہ اکثر رات گئے تک ان کا وقت لے لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت اچھی صحت اور طویل زندگی کی ضامن ہے۔ ان کا کھانا یورپین طرز پر ہوتا ہے۔ اور وہ کسی قسم کی نشہ آور مشروبات استعمال نہیں کرتے بلکہ صرف پانی پیتے ہیں۔ رات کے کھانے پر یا کھانے کے بعد ان کے بعض احباب آجاتے ہیں۔ اور زیر گفتگو مسائل میں فزکس، مذہب و سیاست، فارسی شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف ہوتے ہیں۔ ان کا اوسط قد ہے۔ مگر جسم گھٹا ہوا ہے اور وزن ۱۹ اسٹون سے نکلا ہوا ہے۔ ان کا چہرہ شاندار ہے۔ اس سے ان کا عزم اور قوت ارادی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر جب وہ آرام کرتے ہیں تو چہرہ پر دل کا جوش جھلکنے لگتا ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ وہ قہقہے بھی لگاتے ہیں اور عام لوگوں کی طرح مذاق بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ ایک پیدائشی مقرر اور خطیب ہیں۔ وہ جس وقت گرمجوشی سے تقریر کرتے ہیں تو ان کا طرز تقریر گلیڈسٹون کا سا ہو جاتا ہے۔ جذبات سے ان کے ہونٹ تھرتھرانے لگتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے اور بدن کانپنے لگتا ہے۔ شدت جذبات کا یہ اظہار سننے والوں پر خاص اور فوری اثر رکھتا ہے۔"

تقریباً یہ طرز اور یہی نظام آخر تک رہا۔

اس ''کرستان'' پر ہزار مسلمانی نثار

سرسیّد کے ایک دوست ضلع سہارنپور سے ان سے ملنے آئے۔

دوست: سیّد صاحب! خبر بھی ہے کہ خلق خدا غائبانہ کیا کہتی ہے؟

سرسیّد: آپ ہی بتائیے۔

دوست: میں ضلع سہارنپور سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک مجلس میں آپ کے حال پر بحث ہو رہی تھی۔

سرسیّد: کیا فرما رہے تھے وہ لوگ؟

دوست: باقی باتیں تو اپنی جگہ، ایک صاحب کہنے لگے:

''ہے تو کرستان، مگر ہماری قوم کی بھلائی اگر ہوگی تو اسی کرستان سے ہوگی۔''

سرسیّد: (بہت خوش ہوکر) ''اگر درحقیقت مجھ سے ایسا ہوا تو ''کرستان'' خطاب پر ہزار مسلمانی نثار۔''

صائب نے ایک ناواقف شاعر سے پوچھا کہ صائب کیسا شعر کہتا ہے۔ اس نے نہایت دلی جوش سے کہا۔

آں قرم ساق ہمہ خوش می گوید

صائب کہتا ہے جیسی عزت مجھے قرم ساق کے لفظ سے حاصل ہوئی، اعلیٰ سے اعلیٰ خطاب سے بھی ممکن نہیں۔

اسی طرح خدا کرے کہ یہ لفظ ''کرستان'' میرے لئے عزت قومی کا باعث ہو۔

(حالات وافکار سرسیّد احمد، مولوی عبدالحق، صفحہ ۱۲)

دل دردمند کی ایک دل دوز استدعا

سرسیّد نے جب جدید تعلیم کا پرچم اٹھایا اور کالج کے قائم کرنے کیلئے چندہ کرنے نکلے تو کچھ کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر ان کے خلاف مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھا تھا۔ اس سلسلہ میں حالی لکھتے ہیں:

''۱۸۷۴ء میں جب پہلی بار انہوں نے لاہور میں لیکچر دیا، جہاں لاہور کے تمام جلیل القدر عہدہ دار اور حاکم اور شہر کے ہندو اور مسلمان رئیس ادنیٰ اور اعلیٰ تقریباً دس بارہ ہزار آدمی جمع تھے، تو مذہبی مخالفتوں کا ذکر کر کے انہوں نے کہا کہ:

''فرض کرو میں ایک بدعقیدہ شخص ہوں۔ مگر اے بزرگان پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیر خواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کیلئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، یا آپ کیلئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چوڑھے، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کو منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھ کو بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی، چمار کی مانند تصور کیجئے۔ اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی، چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔''

خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر

جیسا کہ حالی کے حوالے سے گزشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے، سرسیّد شروع سے اپنی والدہ کی طرح صدقہ و خیرات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مستحقوں کیلئے ان کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ مسجدوں کی تعمیر و تکمیل میں ان کی خصوصی دلچسپی تھی۔ لیکن جب ۱۸۷۰ء میں انگلستان سے آ کر انہوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی داغ بیل ڈالنے کی تگ و دو شروع کی تو ان کی سوچ کا رخ بدل گیا۔ اب ان کی نظر میں سب سے بڑا کارِ خیر، سب سے بڑی نیکی، قوم کے بچوں کیلئے جدید مدرسۃ العلوم کی تعمیر و تکمیل تھی۔

حالی ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں:

''ان کے خیالات بدلنے کے بعد جب سہارنپور کی جامع مسجد کے لئے ان سے چندہ طلب کیا گیا تو انہوں نے یہ جواب دیا:

''میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں۔ اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔''

مدرستہ العلوم قائم کرنے کے بعد تو وہ سائل کو کبھی اپنے دروازے پر پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ اور بجائے اس کے کہ شخصی امداد کو کوئی کارخیر سمجھتے ہوں اس کو ایک قسم کی معصیت جانتے تھے۔ اور یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے لوگوں کی امداد کرنا ان کو ہمیشہ کیلئے دریوزہ گر بنانا ہے۔ اسی لئے ان کی تمام فیاضی اور داد و دہش قوم کی تعلیم میں منحصر ہوگئی تھی۔ جس درشتی اور سختی کے ساتھ وہ سائل کو جھڑکتے اور اس پر دور دبک کرتے تھے اس کو دیکھ کر ناواقف آدمی ان کو سخت بداخلاق اور بدمزاج تصور کرتا تھا۔ مگر ان کا غصہ اور دور دبک کرنا سراسر مصنوعی ہوتا تھا۔ ان کا یہ قول تھا کہ لوگوں کے اخلاق درست کرنے کیلئے بداخلاق بننا نہایت ضروری ہے۔''

(حیات جاوید، حالی)

بددماغ افسروں سے ملنے سے انکار

سرسیّد کو جب کبھی ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کا حال معلوم ہوتا تو سخت آزردہ ہوتے اور اس کا اظہار بھی کرتے۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''سرسیّد احمد خان (حالات و افکار)'' میں ان سے اپنی گفتگو کا حال لکھا ہے:

مولوی عبدالحق: قبلہ! وہ سیشن جج سے ملاقات نہ کرنے کا کیا قصہ تھا؟

سرسیّد: کچھ دنوں کی بات ہے، علی گڑھ میں ایک انگریز سیشن جج آئے تھے جن کی نسبت یہ شکایت عام تھی کہ ہندوستانیوں سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ چنانچہ میں ان سے نہیں ملا۔

مولوی عبدالحق: پھر کیا ہوا؟

سرسیّد: کچھ دنوں بعد لیفٹیننٹ گورنر علی گڑھ تشریف لائے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے اب تک آپ سیشن جج صاحب سے نہیں ملے؟

مولوی عبدالحق: آپ نے کیا جواب دیا؟

سرسیّد: میں نے کہا، اول تو ان کو اپنے آداب کے مطابق مجھ سے ملنے آنا چاہیے تھا۔ خیر یہ بھی نہ سہی، اصل بات یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ اس لئے میں نے ان سے ملنا پسند نہیں کیا۔

مولوی عبدالحق: لیفٹیننٹ گورنر صاحب کا ردعمل کیا تھا؟

سرسیّد: وہ اس وقت تو چپ رہے۔ البتہ چند روز بعد سیشن جج صاحب خود ملنے آئے۔ ایسے بد دماغ افسروں کی کمی نہیں۔ اور مسٹر واٹسن تھے۔ علی گڑھ میں کلکٹر ہو کر آئے۔ وہ کسی ہندوستانی کو جوتا اتارے بغیر اپنے کمرے میں نہیں آنے دیتے تھے۔ میں ان سے بھی ملنے نہیں گیا۔
(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان (حالات وافکار) صفحہ ۲۳)

مثالی دیانت داری

بحثیت مصنف اور جج سرسیّد کی کارکردگی کس درجہ کی تھی، اس بارے میں ''حیات جاوید'' میں حالی لکھتے ہیں:

''دیانت داری کی صفت ان کی تمام پبلک سروس میں ایسی نمایاں رہی جیسے آفتاب میں روشنی۔ صہیب رومی کی نسبت آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''نعم العبد صهيب لو لم نخف الله لم يعصه''

(صہیب ایسا نیک بندہ ہے کہ اگر وہ خدا سے نہ ڈرتا تو بھی اس کی نافرمانی نہ کرتا)

یہی حال سرسیّد کے تدین کا تھا۔ وہ نہ کسی حاکم کے خوف سے اور نہ شرع امتناع کی وجہ سے بلکہ محض اپنی طبیعت کے اقتضا سے کوئی کام دیانت داری کے خلاف نہیں کر سکتے تھے۔ غدر سے پہلے ان کا تدین بہت خوفناک صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔ اہل مقدمہ کو یہ جرأت تو نہ ہوتی تھی کہ ان کے سامنے کچھ نذرانہ پیش کریں یا ایسا پیغام بھیجیں۔ البتہ کبھی کبھی ناواقف لوگ دوران مقدمہ میں ان کے مکان پر صرف ملنے کے بہانے یا کوئی سوغات لے کر چلے آتے تھے۔ سوغات کا قبول کرنا تو درکنار ہم نے سنا ہے کہ وہ سوغات لانے والے سے اس قدر بدگمان ہو جاتے تھے کہ اس کا اثر مقدمہ کے فیصلہ تک پہنچتا تھا۔ آخر اہل مقدمہ نے اثنائے تحقیقات میں ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ جھوٹے مقدمے بنانے والے اور جھوٹی گواہیاں دینے والے ان کے نام سے کانپتے تھے۔ نہ ان سے اپنوں کو رعایت کی توقع تھی اور نہ غیروں کو بے انصافی کا اندیشہ۔''

کارکردگی بحثیت جج

۱۸۷۶ء میں جب سرسیّد بحثیت جج عدالت کے منصب سے کنارہ کش ہو کر بنارس سے روانہ ہو رہے تھے تو وہاں کے ہندو اور مسلمان رؤساء بشمول یورپین حکام، نے ان کو ایک وداعی ایڈریس دیا تھا۔

ایڈریس: آپ کی سرکاری، ملکی، قومی خدمات اپنی جگہ، ہم آخر میں آپ کے بے لاگ انصاف اور بے تعصّبانہ فیصلوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی مثال ڈھونڈنے سے بھی مشکل سے ملے گی۔

سرسیّد: اگر میں نے قانون کی تعمیل انصاف کے ساتھ بلالحاظ کسی کے رتبہ اور قوم اور رنگ یا مذہب کے کی تو اس کے لحاظ سے میں کسی شکریہ کا مستحق نہیں ہوں۔ مجھ کو تمام عمر اس بات کی فکر رہی ہے کہ جو بڑا فرض مجھ کو تفویض ہوا ہے اس کو ایمانداری کے ساتھ انجام دوں۔ میں اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو ہمیشہ خوب سمجھتا رہا ہوں۔ دنیا کی دولت اور عزت پر سچ بات کو فوقیت دی ہے اور اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا جواب دہ سمجھا ہے نہ کہ انسان کا۔ گو میں نے اپنی رائے میں غلطی کی ہو میں نے ہمیشہ اپنے ایمان کی ہدایت پر عمل کیا ہے۔ باوجود اس کے مجھ کو اس بات کے دیکھنے سے کچھ کم خوشی حاصل نہیں ہوتی کہ جو کوششیں میں نے سب لوگوں کے حق میں انصاف کرنے میں کی تھیں ان کی قدر شناسی میرے ہم وطنوں نے کی ہے۔''

(حیات جاوید، حصہ دوم، صفحہ ۲۸)

بنارس کالج میں سرسیّد کی یادگار

انہی دنوں جب سرسیّد بنارس سے رخصت ہونے والے تھے، شہر کے مسلمانوں نے ان کی یادگار قائم کرنے کیلئے ایک کمیٹی منعقد کی تھی۔ جس کے پریذیڈنٹ راجہ شمبھو نرائن سنگھ بہادر تھے۔ اس کمیٹی میں راجہ صاحب موصوف نے سرسیّد کی یادگار کے طور پر بنارس کالج میں عمارت بنانے کے بارے میں چند فیصلے کئے۔ لیکن سرسیّد نے ایسا نہ ہونے دیا۔

چندہ لینے میں حد درجہ احتیاط

سرکاری ملازمت میں سرسیّد کی کارکردگی اس درجہ کی تھی کہ حکومت ان کی ملازمت میں توسیع کی خواہشمند تھی۔

حالی: قبلہ سیّد صاحب، حکومت تو آپ کو مزید کام کرنے کی مہلت دینا چاہتی تھی۔ آپ نے مدت ملازمت پوری ہونے سے پہلے ۱۸۷۶ء میں پنشن لینا مناسب سمجھا، اس میں کیا مصلحت تھی؟

سرسیّد: ایک خاص وجہ یہ تھی کہ مئی ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم قائم ہو چکا تھا جس کے لئے چندہ جمع کرنے کی از بس ضرورت تھی۔ ملازمت کی حالت میں چندہ وصول کرنا میں خلاف احتیاط سمجھتا تھا۔ دوران ملازمت بنارس میں میں نے اپنے قریبی دوستوں کے سوا کسی سے چندہ طلب نہیں کیا۔

(حیات جاوید، صفحہ ۲۳، جلد دوم)

جلد پنشن لینے کی اصل وجہ

۱۸۷۵ میں مدرستہ العلوم قائم ہوتے ہی سرسیّد نے پنشن کیلئے درخواست دے دی تھی۔

جولائی ۱۸۷۶ء کے آخر میں پنشن کی منظوری بھی آ گئی۔

حالی: سیّد صاحب! آپ نے جلد پنشن لینے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

سرسیّد: کچھ تو سرکاری کاموں کی مصروفیت مدرسہ کے کام میں حارج ہوتی تھی۔ لیکن اصل وجہ میری جبلی احتیاط تھی۔ بہ سبب سرکاری عہدہ دار ہونے کے میں چندہ وصول کرنے سے ہچکچاتا تھا۔

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۱۹۴)

اپنے مشن کا بیان

جولائی ۱۸۷۶ء میں سرسیّد پنشن لے کر مستقل طور پر علی گڑھ میں رہنے کیلئے بنارس سے آئے تو ضلع علی گڑھ کے روٴساء اور معزز لوگوں نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ اور ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں ان کے احسانات کا ذکر تھا جو قوم کی بھلائی کیلئے ان سے ظہور میں آئے۔ جواباً سرسیّد نے کہا:

''ہاں یہ بات سچ ہے کہ میں نے اپنے اس قدیم نامی اور پرانے شہر کو جہاں میرے بزرگوں اور عزیزوں کی ہڈیاں اب تک زمین میں پڑی ہیں اور جہاں میرے بہت سے عزیز اب تک رہتے ہیں، جس کی مٹی سے...... میں بنا ہوں اور پھر اسی میں میری خاک مل جائے گی، صرف مدرستہ العلوم کی محبت، اپنی قوم کی بھلائی اور رئیسان ضلع علی گڑھ و بلند شہر کی محبت و عنایت کے خیال سے چھوڑا ہے۔ اور یہاں ایک غریب مسافر کی طرح سکونت اختیار کی ہے۔ میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود و عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی۔ اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کیلئے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرستہ العلوم قائم کیا جائے، جس کی بنا آپ کے شہر میں اور آپ کے زیر سایہ پڑی ہے۔''

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۱۹۵)

صلہ کی پروا نہ ستائش کی تمنا

سرسیّد جس معیار کے رول ماڈل تھے، اس میں خود پرستی اور خودنمائی کا شائبہ تک نہیں تھا، اور یہی ان کی بڑائی کا راز تھا۔

''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے''

انہی کیلئے کہا گیا تھا۔

بقول حالی ہر چند کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر، درحقیقت، انہی کو حاصل ہوتا تھا لیکن انہوں نے ہمیشہ اس اعزاز کوقبول کرنے سے انکار کیا۔ کہ کالج میں ان کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔

جب اوّل اوّل کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی اور کالج کے قیام کے انتظامات مکمل ہو گئے تو چند احباب ان کے پاس آئے۔

احباب: اب جبکہ مدرسہ قائم کرنے کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں آپ کی بھاگ دوڑ سے، ہماری تجویز یہ ہے کہ مدرسہ کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا جائے۔

سرسیّد: نہیں، ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔

احباب: آپ چاہیں یا نہ چاہیں کلکتہ کے اخبار اردو گائیڈ نے یہ نام اپنے پرچے میں......

سرسیّد: اگر اردو گائیڈ نے یہ نام چھاپا ہے تو یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اس تجویز سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس امر کے سخت خلاف ہوں کہ کالج میرے نام سے موسوم کیا جائے۔

(حیات جاوید، صفحہ ۲۰۸)

یادگاری عمارت کا مسئلہ

۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کی مدرستہ العلوم کے نام سے داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ ۱۸۷۷ء میں اس کا باقاعدہ افتتاح اینگلو محمڈن کالج کے نام سے ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں سرسیّد پنشن لے کر علی گڑھ آئے تو کالج دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اور کالج کی عمارت بننے کا آغاز ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں آنریبل حاجی محمد اسماعیل خان کو خیال پیدا ہوا کہ سرسیّد کالج کے لئے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ان کا نام بھی کہیں آنا چاہیے۔ انہوں نے سرسیّد کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت کا چندہ ان کی یادگار میں بنانے کیلئے کھولا۔ تجویز یہ تھی کہ کالج کا ایک شاندار صدر دروازہ بنوایا جائے جو سرسیّد کے نام سے منسوب ہو۔ اور اس کی پیشانی پر سرسیّد کے نام کا کتبہ لگوایا جائے۔

سرسیّد: حاجی صاحب! میں آپ کی تجویز سے قطعاً متفق نہیں ہوں۔

اسماعیل خان: آخر کیوں؟

سرسیّد: مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ آپ وصول کرنے کی امید رکھتے ہیں، ان کی نظر میں میری اور میرے کاموں کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے تو پھر آپ چندہ کس سے وصول کریں گے۔

اسماعیل خان: قبلہ سیّد صاحب، یہ ہمارا مسئلہ ہے چندہ ملتا ہے یا نہیں۔ کالج کا شایان شان صدر دروازہ

ضروری بنانا چاہیے۔ یہ ایک اشد ضرورت ہے۔ چونکہ یہ سب سلسلہ آپ کے دم قدم سے ہے اس لئے اسے آپ یادگار کے طور بنانا چاہیے۔

سرسیّد: میں آپ کی تجویز کے پہلے حصے سے سو فیصد متفق ہوں کہ کالج کا صدر دروازہ ضرور بنانا چاہیے۔ مجھے اعتراض اس تجویز کے دوسرے حصے یعنی اس کی پیشانی پر میرے نام کا کتبہ لگانے سے ہے۔

اسماعیل خان: ہم نے چندہ ہی آپ کی یادگار بنانے کیلئے کھولا ہے۔ اس لئے کتبہ تو ضرور لگے گا۔

سرسیّد: میری دلچسپی صدر دروازہ بننے میں ہے۔ اگر آپ بضد ہیں تو میری شرطیں مان لیں۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے قومی بھلائی کیلئے یہ کالج بنایا ہے۔ دوسرا یہ کہ میرے نام کا مجوزہ کتبہ دروازے کے اندرونی جانب لگایا جائے اور میرے نام کے ساتھ اس کام میں میرے دست راست مولوی کا نام اور آپ کا نام بھی ہو، چونکہ اس عمارت کی تعمیر کے محرک خاص ہیں۔

اسماعیل خان: آپ کی پہلی شرط تو ہمیں منظور ہے۔ لیکن دوسری شرط کہ ہم دو محرکوں کا نام بھی کتبہ پر کندہ کیا جائے۔ ہمیں منظور نہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں کوئی کتبہ لگایا جائے اور اس میں دوسروں کے نام بھی شامل کئے جائیں۔

سرسیّد: اگر کتبہ میں آپ کو اپنا نام منظور نہیں تو مجھے اپنا نام منظور نہیں۔

کالج کیلئے چندہ جمع کرنے کے نت نئے جتن

کالج کی عمارتوں کیلئے روپیہ جمع کرنے کو جو جتن کئے تو کئے، کالج کے دوسرے اخراجات پورے کرنے کیلئے بھی سرسیّد کا تخلیقی ذہن نت نئے طریقے اختراع کرتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند کہ لوگوں نے سخت مخالفت کی۔ لیکن سرسیّد نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ اور بعد تقسیم انعامات بیس ہزار کے قریب روپے کالج فنڈ میں جمع کرا دیئے۔

جن دنوں لاٹری کی تجویز زیر غور تھی، علی گڑھ کے نواحی علاقہ کے دو ثقہ رئیس سرسیّد کے پاس آئے۔ اس وقت سرسیّد کے ایک اور دوست بھی موجود تھے۔

رئیس: سیّد صاحب! آپ کو پتہ ہے کہ لاٹری ڈالنا اسلام میں جائز نہیں۔

سرسیّد: صحیح!

رئیس: کیا صحیح؟

سرسیّد: یہی کہ لاٹری ڈالنا جائز نہیں۔

رئیس: تو پھر آپ لاٹری کیوں ڈال رہے ہیں؟

سرسیّد: میرا جواب یہ ہے کہ جہاں ہم اپنی ذات کیلئے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کیلئے بھی ایک ناجائز کام سہی۔

دوست: لاٹری کا گناہ درحقیقت رئیسوں اور دولتمندوں پر ہوگا۔ اگر وہ مدرسہ کی مدد کرتے تو لاٹری کی ضرورت کیوں پڑتی؟

مدرسہ کیلئے قلیل سے قلیل چندہ کو بھی ویسی ہی خوشی ور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے جیسے بڑی بڑی رقمیں لیتے تھے۔ لوگ دو دو آنے اور چار چار آنے دیتے تھے اور وہ چوم چاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ ایک صاحب نے ناچ کی محفل میں اہل محفل سے چندہ جمع کیا۔ یہاں تک کہ طوائف اور سازندوں نے بھی چندہ دیا۔

(حیات جاوید، صفحہ ۲۰۴)

لاٹری کے سوا انہوں نے اور بے شمار تدبیروں سے روپیہ جمع کیا۔ اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابیں فروخت کر کے روپیہ پیدا کیا۔ اپنی تصویر کی کاپیاں بیچیں اور جو کچھ ملا کالج کو دے دیا۔ جب خلیفہ سیّد محمد حسن خان وزیر ریاست پٹیالہ کے پوتا پیدا ہوا۔ اور انہی دنوں سرسیّد کا پٹیالہ جانا ہوا تو وزیر صاحب سے پوتے کے ہونے کی خوشی میں چراغی کے پانچ روپے طلب کئے۔ جس پر انہوں نے ایک معقول رقم ان کی نذر کی۔ ان کے ایک دوست قبال دور و دراز سفر سے علی گڑھ آئے۔ آپ سیادت کے دعوے سے ان کے ہاں امام ضامن کا روپیہ مانگنے کیلئے پہنچے۔ اور وہاں سے ایک اشرفی اور کچھ روپے لے کر آئے۔

چندہ وصول کرنے کے موقع پر انہوں نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ میں کون ہوں؟ کس سے مانگتا ہوں؟ اور کس طرح مانگتا ہوں؟ نمائش گاہ علی گڑھ میں انہوں نے کتابوں کی دکان لگائی۔ اور خود کتابیں بیچنے کیلئے دکان پر بیٹھے نیشنل والنٹیئر بن کر گلے میں جھولی ڈالی۔ پینی ریڈنگ کا جلسہ کیا اور سٹیج پر کھڑے ہو کر غزلیں گائیں۔

پینی ریڈنگ کا جلسہ اس لئے قرار دیا گیا تھا کہ غریب طالب علموں کے وظیفہ کیلئے کچھ سرمایہ جمع کیا جائے۔ جب اس جلسہ کی تجویز ٹھہری تو دوستوں نے منع کیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔ لوگ مطعون کریں گے۔ اور تماشے والا کہیں گے۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔ سرسیّد نے کہا:

''اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو۔ بلکہ یہ دیکھو کہ اس سے درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟''

جس وقت وہ سٹیج پر کھڑے ہوئے تو انہوں نے ایک نہایت موثر تقریر کی جس کے چند فقرے یہاں لکھے جاتے ہیں:

''کون ہے جو آج مجھ کو اس سٹیج پر دیکھ کر حیران نہ ہوتا ہوگا؟ وہی جن کے دل میں قوم کا درد نہیں۔ جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخت سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں۔ اور جو کام قوم اور انسان کی بھلائی کیلئے نیک نیتی سے کئے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں۔ آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کیلئے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں۔ مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسے بے شرمی اور بے حیائی کا کام کرے جن سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے۔ لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم و نفرین کا کام سمجھے۔''

''اے رئیسو اور اے دولتمندو! تم اپنی دولت و حشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بری حالت ہو مگر ہمارے بچوں کیلئے سب کچھ ہو۔ یہی ان کا لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اب انہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے۔ جس کیلئے ہم آج اس سٹیج پر کھڑے ہیں۔ اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل اور رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے۔ کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی، مگر قلیل ملی۔ والنٹیئر بنانے چاہے، مگر بہت کم بنے اور جو بنے ان سے کچھ نہ بن آئی۔ پس آج اس سٹیج پر اس لئے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کیلئے کچھ کر سکوں۔''

اس کے بعد سرسیّد نے کچھ اور تقریر کی۔ اور آخر کو خواجہ حافظ کی یہ غزل بہ اضافہ اشعار حسب حال جلسہ میں پڑھی:

ساقیا بر خیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر مے بر کفم نہ تا زبر
برکشم ایں دلق ازرق فام را
گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

بادہ دردہ چند ازیں بادہ غرور
خاک بر سر نفس نافرجام را
دودِ آہِ سینۂ نالانِ من
سوخت ایں افسردگان خام را
محرم راز دل شیدائے خود
کس نمی بینم زخاص و عام را
با دِلآرامے مرا خاطر خوش است
کز دلم یکبارہ برد آرام را
ننگر و دیگر بسر اندر چمن
ہر کہ دید آں سرو سیم اندام را
کیست آں سرو سہی کاندر سرش
باختم دیں و دل و آرام را
قوم ما! اے قوم ما! کز بہر تو
دادہ ام برباد ننگ و نام را
صبر کن احمد بہ سختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

غرض کہ سرسیّد نے مدرسہ کی خاطر ہر ایک بات کو اپنے نفس پر گوارا کر لیا تھا۔

پینی ریڈنگ کا جلسہ

سرسیّد جب انگلستان گئے تھے تو انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی نگارشات خود سناتے دیکھا تھا۔ چارلس ڈکنز کی آخری ریڈنگ کے سامعین میں بھی وہ موجود تھے۔

کالج کے مختلف شعبوں کے لئے پیسہ جمع کرنے کیلئے وہ انوکھے طریقے وضع کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے غریب طالب علموں کیلئے وظیفہ جمع کرنے کیلئے کچھ سرمایہ جمع کرنے کی ایک نئی تدبیر سوچی۔ وہ پینی ریڈنگ کا جلسہ تھا۔ اس تجویز کی بھنک دوستوں کے کان میں پڑی تو دو ایک خیرخواہ سرسیّد کے پاس آئے۔

دوست: سنا ہے کہ آپ پینی ریڈنگ کا جلسہ کر رہے ہیں؟

سرسیّد: ہاں، کر رہا ہوں۔ انگلستان میں چندہ جمع کرنے کا یہ ایک آبرومندانہ طریقہ ہے۔

دوست: ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔

سر سیّد: کیوں؟

دوست: لوگ طعنے دیں گے۔ کہیں گے، سر سیّد تماشے کرتا ہے۔ جگ ہنسائی ہو گی۔ اخباروں میں ہنسی اڑائی جائے گی۔

سر سیّد: اگر میں لوگوں کے کہنے کا خیال کرتا تو جو کچھ اب تک کیا ہے اس میں سے کچھ بھی نہ کر سکتا۔ لوگوں کے کہنے کا کچھ خیال نہ کرو۔ بلکہ یہ دیکھو کہ درحقیقت قوم کو فائدہ پہنچے گا یا نہیں۔

مدرسہ کے چندہ کیلئے سفر اپنے خرچ پر

ایک بار ایک دوست نے فرمائش کی:

دوست: آپ راجپوتانہ کا بھی ایک دورہ کیجئے۔

سر سیّد: روپیہ نہیں ہے۔

دوست: جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفر خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔

سر سیّد: میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کیلئے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

حالی لکھتے ہیں:

''مدرسہ کیلئے انہوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کئے۔ پٹنہ، گورکھپور، الہ آباد، مرزاپور، لاہور، امرتسر، پٹیالہ، حیدرآباد، نیل گری، بھوپال، جبل پور اور دیگر مقامات میں وہ صرف مدرسہ کی دھن میں گئے۔ لاہور اور حیدرآباد متعدد دفعہ اس غرض سے جانا ہوا۔ ہزار ہا روپیہ ان سفروں میں ان کا صرف ہوا۔ اگرچہ ان کے دوست اور رفیق بھی جو ان کے ہمراہ جاتے تھے، اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے۔ اور سر سیّد کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا۔ اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں ان کی کمی زیادہ تر سر سیّد کو پورا کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار ان کے ایک دوست نے ان سے کہا کہ آپ راجپوتانہ کا بھی ایک بار دورہ کیجئے۔ سر سیّد نے کہا، روپیہ نہیں ہے۔ ان کے منہ سے نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔ سر سیّد نے کہا، میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے، مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کیلئے سفر کر سکتا ہوں، جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اٹھا سکوں۔

ایک اور طریقہ انہی سفروں میں چندہ جمع کرنے کا انہوں نے یہ نکالا کہ جو احباب دعوت کرنا چاہتے تھے ان سے نقد روپیہ لے لیتے اور کالج کے چندے میں جمع کر دیتے تھے۔ جب وہ دوسری بار پنجاب کو جانے لگے تو انہوں نے خان بہادر برکت علی خان کو ایک خط لکھا جس کا

خلاصہ یہ تھا کہ:

''آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا اور احباب میری مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں ازراہ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لیا ہے۔ اور اس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک دوست نے مجھے دعوت کی بابت نقد روپیہ عنایت کیا۔ میں نہایت خوش ہوا کہ مدرستہ العلوم کے کئی مزدوروں کی مزدوری ملی۔ وہ دوست بھی خوش ہوئے کہ دعوت ٹھکانے لگی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ چند دوست بھی ہوں گے۔ پس اگر یہ طریقہ دعوت اختیار نہ کیا جائے گا تو جن کے ہاں ٹھہروں گا ان پر خرچ کثیر پڑ جائے گا۔ اور وہی مثل ہوگی ''گدھے کا کھایا کھیت جس کا پاپ نہ پُن۔''

(حیات جاوید، صفحہ ۲۰۵)

دعوت کے پیسے

حیدر آباد کے سفر میں جو ۱۸۸۲ء میں سرسیّد نے کیا تھا جس قدر روپیہ دعوت میں آیا، وہ سب انہوں نے چندہ میں جمع کرا دیا تھا۔ جب وہاں سے واپس آئے اور علی گڑھ کے دوستوں کو یہ معلوم ہوا تو ان کے پاس آئے:

احباب: ہم نے بیس روپیہ فی کس دوسو بیس روپے اس لئے جمع کئے ہیں کہ آپ کو دعوت دی جائے۔

سرسیّد: کس لئے؟

احباب: شکر گزاری کیلئے۔

سرسیّد: بجا! لیکن اس کا انتظام میں خود کروں گا۔

اس ضمن میں حالی لکھتے ہیں:

''سیّد صاحب نے وہ سب روپیہ ان سے لے کر بیس روپے اپنے حصہ کے اس میں ملا کر دوسو چالیس روپیہ کی دو سکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کے غریب طالب علموں کے لئے مقرر کر دیں۔ ان کے دوستوں نے کہا کہ آپ نے اپنے ساتھ ہم کو بھی دعوت سے محروم رکھا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دھوم سے سب کی دعوت کی۔''

سیّد محمود کی شادی میں نواب انتصار جنگ نے سو روپے بطور اظہار مسرت کے اس غرض سے بھیجے تھے کہ کالج میں صرف کئے جائیں۔ اس پر سرسیّد نے نہایت خوشی ظاہر کی اور اخبار میں لکھا کہ:

''ہمارے بعض دوست نیوتا نہ لینے سے ناراض ہوئے مگر ہم نیوتا لینے کو موجود تھے۔ اگر اس

کا روپیہ اس طرح مدرستہ العلوم میں خرچ کرنے کو دیا جاتا۔''
پھر لکھا کہ:
''بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی۔ مگر ہم نہ جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں۔ اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپے لگا سکتے تھے۔ سو ہم نے پانچ سو روپیہ مدرسہ میں دے دیا۔''

پوتے کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی جو ۱۸۹۳ء کی کانفرنس کا اجلاس ختم ہونے کے بعد ممبروں کی موجودگی میں ہوئی تھی، سرسیّد نے ایک نہایت عمدہ تقریر کے بعد اسی طرح پانچ سو روپے مدرسہ کی نذر کئے تھے۔

حیدر آباد کے اخیر سفر میں جب کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن لے کر حضور نظام میں ایڈرس پیش کرنے کو گئے تھے۔ چونکہ تمام ڈپوٹیشن سرکار عالی کا مہمان تھا، سرسیّد کے دوستوں نے جو کچھ ان کی دعوت میں دیا، وہ سب مدرسہ کے چندہ میں جمع کیا گیا۔ نواب انتصار نے تو غالباً ہزار روپے نقد دے دیئے تھے۔ مگر نواب محسن الملک نے بڑی دھوم کی ایک گارڈن پارٹی دینی چاہی تھی۔ سرسیّد نے انکار کیا اور کہا کہ نقد دلواؤ۔ محسن الملک نے کہا، نقد بھی لیجئے اور پارٹی بھی ہونے دیجئے۔ سرسیّد نے ہرگز نہ مانا اور کہا کہ نقد اور پارٹی دونوں میں جس قدر خرچ ہو وہ سب نقد ہی دے دو۔ آخر پارٹی موقوف رہی اور ایک ہزار روپیہ نقد نواب محسن الملک نے سرسیّد کی نذر کیا۔

ابتدائی قیام مدرسہ کے وقت جس طریقہ سے سرسیّد نے نواب مختار الملک مرحوم کو مدرستہ العلوم کی طرف متوجہ کیا وہ یادگار کے قابل ہے۔ انہوں نے ایک مصور سے ایک تصویر بنوائی جس میں مسلمانوں کی حالت اور ان کے تنزل کی کیفیت محض تصویر کے ذریعے ظاہر کی گئی تھی۔ اس کی صورت یہ تھی کہ سرسیّد سمندر کے کنارے ایک درخت سے کمر لگائے حیران اور فکرمند کھڑے ہیں اور اس سے کسی قدر فاصلہ پر مختار الملک دو مصاحبوں کے ایستادہ ہیں۔ سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔ جہاز، جس میں بہت سے مسافر سوار ہیں۔ اس کا مستول ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ ڈوبا چاہتا ہے۔ کچھ آدمی پانی میں گر پڑے ہیں اور ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ ایک کشتی جس میں کچھ سوار ہیں، ان ڈوبتوں کے بچانے کو جہاز کی طرف آ رہی ہے۔ اس کی جھنڈی کے پھریرے پر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ ''One lac Rupees'' (ایک لاکھ روپے) سرسیّد اس حیرت اور تشویش کی حالت میں کہہ رہے ہیں کہ ''Not Sufficient'' یعنی یہ روپیہ کافی نہیں ہے۔ ایک فرشتہ آسمان سے اترا ہے جو ہوا میں معلق ہے اور ایک ہاتھ سے سرسیّد کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلی سے نواب مختار الملک کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور سرسیّد سے کہتا ہے

''Look at this nobel man'' یعنی اس شریف آدمی کی طرف دیکھو۔

اس تصویر میں سمندر سے زمانہ مراد ہے۔ اور جہاز سے مسلمانوں کی قوم کشتی جو جہاز والوں کی دستگیری کے لئے جا رہی ہے اس سے مدرستہ العلوم مراد ہے۔ اس کے پھریرے پر جو "ایک لاکھ روپیہ" کا لفظ لکھا ہے۔ اس سے وہ لاکھ روپیہ مراد ہے جو اس وقت تک مدرسہ کے لئے جمع ہوا تھا۔ سرسیّد گویا مسلمانوں کی سقیم حالت دیکھ کر اپنے دل میں یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ابھارنے کیلئے ایک لاکھ روپیہ کافی نہیں ہے۔ اس وقت خدا کی طرف سے ان کے دل میں القا ہوتا ہے کہ نواب مختار الملک سے مدد مانگنی چاہیے۔ فرشتہ کا ان کی طرف اشارہ کرنا اسی مضمون پر دلالت کرتا ہے۔

یہ تصویر نواب مختار الملک سیّد تراب علی خان کی خدمت میں بھیجی گئی۔ اور وہ اس کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ سنا ہے وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "اس تدبیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر روپیہ مانگنے کی میرے دل پر موثر نہیں ہو سکتی تھی۔" انہوں نے سو روپیہ ماہوار اپنی خاص جاگیر سے اور اول تین سو اور پھر پانچ سو ماہوار سرکار عالی نظام سے مقرر کئے۔ اس کے بعد جب حضور نظام نے عنان اختیار اپنے ہاتھ میں لی تو پانچ سو روپے ماہوار کا دو دفعہ کر کے اور اضافہ ہوا۔ پھر ۱۸۹۱ء میں جب سرسیّد ڈیپوٹیشن لے کر حیدر آباد گئے تو حضور نظام نے بجائے ایک ہزار کے دفعتاً دو ہزار روپیہ ماہوار ہمیشہ کیلئے مقرر کیا۔ اور اس کی سند سرسیّد کو عنایت فرمائی۔ درحقیقت یہ اسی تصویر کا نتیجہ تھا جو رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچ گیا۔

غرض کہ اس قسم کی بے شمار تدبیروں سے سرسیّد نے مدرسہ کیلئے سرمایہ جمع کیا۔ ولایت سے واپس آ کر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے۔ اس عرصہ میں برابر ان کی یہی ادھیڑ بن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لئے اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرستہ العلوم میں مہیا کیا جائے۔ ان کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے ان کو مسلمانوں کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا انہوں نے چند اصول گویا اپنے اوپر لازم کر لئے تھے۔ اولاً انہوں نے ہر قسم کی داد و دہش سے اپنا ہاتھ روک لیا۔ مدرستہ العلوم کے سوا رفاہ عام کے اور کاموں میں چندہ دینا، شادی اور غمی کی رسموں میں روپیہ صرف کرنا، اپنے کنبے کے حقداروں کے سوا عموماً مساکین و غرباً کی امداد کرنا اور اسی قسم کے تمام ابواب یک قلم بند کر دیئے۔ اور جہاں تک ہو سکا مدرسہ کے چندوں میں آپ بھی دیا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں سے بھی لیا۔ اور اپنے دل میں یہ ٹھان لی کہ جو لوگ مدرسہ کی اعانت کریں وہی دوست ہیں اور وہی عزیز و رشتہ دار ہیں۔ اگر غیروں نے اعانت کی تو ان کو دوست اور عزیز سمجھا۔ اور اگر دوستوں اور عزیزوں نے پہلو تہی کی تو ان کو سو غیروں کا غیر جانا۔ انہوں نے ایک بار اپنے بچپن کے ایک نہایت گاڑھے دوست کو جو ذی مقدور آدمی تھے، مگر مدرسہ کے کچھ سرگرم معاون نہ تھے، صاف یہ کہلا بھیجا تھا کہ بغیر مدرسہ کی اعانت کے دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے، جب سے انہوں نے مدرسہ کیلئے چندہ جمع کرنا شروع کیا مروت اور لحاظ کو جو ان

کی ایک جبلی خصلت تھی بالکل بالائے طاق رکھ دیا۔ جن سے بے تکلفی اور خالص دوستی تھی اکثر ان کا نام اور ان کی رقم چندہ کی فہرست میں بغیر ان کے استمزاج کے لکھ دی جاتی تھی۔ اور ان کو صرف اس وقت خبر ہوتی تھی جب ان سے روپیہ مانگا جاتا تھا۔ بعض اوقات وہ انکار کرتے تھے۔ اور ادھر سے اصرار بلکہ ناراضگی کا اظہار ہوتا تھا۔ اور آخر بغیر دیئے کچھ نہ آتا تھا۔ سرسیّد کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکتے۔ وہ ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا تو اب یہ حال ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ مَیں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بد ملاتا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کیلئے اس پر سعدی کا ایک شعر یاد آیا اور دل نے چاہا کہ اس میں کچھ مصرے لگ جائیں تاکہ حسب حال ہو جائے۔ سو ایک خدا کے بندے نے مصرعے لگا دیئے اور اس شعر کی صورت ہو گئی:

گفت در باب گدایاں سخن از صدق و یقیں
گر گدا پیشِ توقع برود تا در چنیں
لیک در نوبت ما کار بجائے برسیہ
کہ بہ کافر چہ رسد خود بتوان گفت چنیں
گر گدا پیشرو لشکر اسلام بود
ہم مسلماں رود از بیم سوالش تا چنیں

ایک بار مدرسہ کے کسی کام کیلئے چندہ کھولا گیا۔ سرسیّد نے اپنے دوست مولوی سیّد زین العابدین خان سے چندہ کا تقاضا کیا۔ انہوں نے بدمزہ ہو کر کہا۔ ''صاحب ہم تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے۔'' سرسیّد نے کہا ''ارے میاں! اب کوئی دن ہم مر جائیں گے، پھر کون تم سے چندہ مانگے گا۔'' یہ الفاظ کچھ ایسے طور پر کہے گئے کہ دونوں آبدیدہ ہو گئے اور چندہ فوراً ادا کر دیا گیا۔

چندہ کے علاوہ جب کبھی ان کو دوستوں سے کچھ اچک لینے کا موقع ملا انہوں نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''خانہ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب'' ایک روز مسٹر تھیوڈور بک کے والد جو سیاحت کے لئے ہندوستان میں آئے ہوئے تھے، ایک خاص سکہ کی اشرفی دوستانہ طور پر مولوی زین العابدین کو دینا چاہتے تھے۔ اور وہ اس کے لینے سے انکار کرتے تھے۔ آخر دونوں صاحب سرسیّد کے پاس آئے اور واقعہ بیان کیا۔ سرسیّد نے بہت بدمزہ ہو کر مولوی صاحب سے کہا کہ دوستوں کے ہدیہ کو رد کرنا نہایت بداخلاقی کی بات ہے۔ انہوں نے وہ اشرفی لے لی۔ سرسیّد نے کہا

دیکھوں کس سکہ کی اشرفی ہے۔ اوران سے لے کر مدرسہ کے کھاتہ میں جمع کردی۔ اسی طرح ایک دن سیّد محمود نے قاضی حسین مرحوم سے کسی بات پر پچاس روپیہ کی شرط باندھی اور یہ ٹھہرا کہ جو ہارے، پچاس روپیہ مدرسہ میں دے۔ اتفاق سے سیّد محمود ہار گئے۔ وہ سو روپیہ کا نوٹ لے کر آئے اور قاضی صاحب سے کہا پچاس روپیہ دیجئے اور نوٹ لیجئے۔ انہوں نے کہا وہ تو ہنسی کی بات تھی۔ کیسی شرط اور کیسا روپیہ؟ دوسرے، شرط باندھنا جائز بھی نہیں۔ سرسیّد بھی وہیں موجود تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روپیہ مدرسہ میں آتا ہے، فرمایا کہ جس شرط میں اپنا فائدہ ملحوظ نہ ہو جائز ہے۔ اورفوراً بکس میں سے پچاس روپے نکال کر سیّد محمود کو دے دیئے اور نوٹ لے لیا۔

اس قسم کے صدہا واقعات روزمرہ گزرتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کرنے سے مدعا یہ ہے کہ جس قوم میں عام طور پر تعلیم کی قدر نہ ہو، جہاں ہر کام کا مدار شخصیت اور ذاتی اغراض پر ہو، جہاں قومی ترقی اور قومی فلاح کے نتائج سے لوگ بے خبر ہوں، جہاں امیر بے پروا، دولتمند مسرف یا بخیل، علماء زمانہ کی ضرورتوں سے ناواقف اور عوام الناس جاہل اور مفلس ہوں، وہاں ایک ایسا کام جس سے تمام قوم کی بھلائی متصور ہو کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ وہ سرسیّد کی طرح اپنے تئیں اس کام میں فنا نہ کر دے۔ اور جو فائدے کہ وہ اپنی عقل مندی، شرافت، لیاقت، وجاہت، دوستی، کوشش اور محنت سے خود اٹھا سکتا ہے ان سے آپ دست بردار ہو کر اس کام پر وقف نہ کردے۔

دوستوں کے علاوہ اجنبی اور انجان آدمی جن سے کچھ وصول ہونے کی امید ہوتی شاید پہلی ایک آدھ ملاقات میں ان کی باری نہ آتی ہو ورنہ اکثر صاحب سلامت ہوتے ہی سوال ڈالا جاتا تھا۔ اور اس میں کچھ مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہ تھی بلکہ انگریزوں سے بھی بعض اوقات یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ ایک بار سرسیّد نے ایک محض اجنبی مسافر انگریز سے جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرا تھا چندہ طلب کیا۔ اس نے بہت روکھے پن سے جواب دیا کہ آپ کو اس کام کیلئے صرف اپنی قوم سے مانگنا چاہیے۔ سرسیّد نے کہا ''بے شک ہم کو قوم کی پست ہمتی سے غیروں کے سامنے ہاتھ پسارنا پڑتا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ انسٹی ٹیوشن بغیر انگریزوں کی اعانت کے قائم ہو گیا تو انگریزوں کے لئے کوئی ذلت کی بات اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ وہ باوجود یکہ ہندوستان کی حکومت سے بے انتہا فائدے اٹھاتے ہیں مگر ہندوستانیوں کی بھلائی کے کاموں میں مطلق شریک نہیں ہوتے۔''

وہ انگریز یہ سن کر شرمندہ ہوا۔ اور اسی وقت ایک نوٹ بیس روپے کا سرسیّد کی نذر کیا۔

سرسیّد نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی سعی اور کوئی کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرستہ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔ جو کوششیں بظاہر وہ خاص اپنی ذاتی اغراض کیلئے کرتے تھے ان سے بھی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان کو اس قدر فائدہ نہیں

پہنچتا تھا جس قدر کہ مدرستہ العلوم کو پہنچتا تھا۔ یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی اپنے یا پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات یا دوستی یا وجاحت سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ مدرستہ العلوم کے سوا کسی کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

جن معنوں میں سرسیّد نے اس پر عمل کیا وہ ایک ایسی جواں مردانہ خصلت تھی جو سرسیّد کے سوا کسی میں نہیں دیکھی گئی۔ وہ محض قوم کی خاطر دوستوں اور عزیزوں کا برا منانا گوارا کرتے تھے۔ اور جو خوشی لوگوں کی سفارش اور ان کی حاجت روائی کرنے سے انسان کو حاصل ہوتی ہے اس کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ سرسیّد کے ایک معزز ہم وطن نے ایک رفاہ عام کے کام میں ان کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا ممبر کرنا چاہا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں صلاح مشورہ سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا۔ اگر اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔

عماراتِ کالج

ہم چاہتے تھے کہ کالج کی عمارات کا حال مفصل طور پر بیان کیا جائے کیونکہ ان تمام عمارتوں کا اس قدر جلد اور ایسی خوبی کے ساتھ تیار کرا دینا اور ایک ویران قطعہ زمین کو چند سال میں محض قومی چندہ سے گلزار بنا دینا اور سینکڑوں پردیسی طلبہ کی تمام ضروریات اور آسائش اور تعلیم و تربیت اور ہر قسم کی ریاضت کا سامان مہیا کر دینا، یہ بھی سرسیّد کی زندگی کے انہی بڑے بڑے کاموں میں سے ایک کام ہے جن کا ذکر ان کی لائف میں کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ہم اس موقع پر تمام کالج اور بورڈنگ کی عمارتوں کا مفصل حال بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ مگر جو اصول کہ سرسیّد نے ان عمارتوں کے بنانے میں ملحوظ رکھے ہیں اور جس کوشش اور توجہ سے انہوں نے یہ دشوار کام آسان کیا اور جن مصالح سے وہ برخلاف اکثر ممبران کمیٹی کی رائے کے، تعمیر کے کام کو سب کاموں سے مقدم سمجھتے رہے ان کو کسی قدر بیان کرنا ضروری ہے۔

کالج کمیٹی کے سرگرم ممبر جو کالج کے کاروبار سے وابستگی رکھتے تھے ان میں بہت ہی کم ایسے ہوں گے جو کالج بلڈنگ میں زیادہ روپیہ صرف کرنے کے روادار ہوں۔ کیونکہ ابتداً میں تعلیم ہی کے اخراجات کیلئے کافی روپیہ بہم پہنچانا دشوار معلوم ہوتا تھا چہ جائے کہ لاکھوں روپیہ کی عمارتیں تیار کرائی جائیں۔ مگر سرسیّد نے کالج کی ترقی بلکہ اس کا قیام و دوام اسی پر منحصر سمجھا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو، اعلیٰ درجے کی سکیل پر عمارتیں بنائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ کالج کے اصلی نتائج علی الاعلان ظاہر ہونے کیلئے جس سے عام لوگوں کو اس کی طرف ترغیب ہو ایک مدت دراز درکار ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی خوبی سمجھنے والے لاکھوں کروڑوں میں ہمیشہ معدودے چند آدمی ہوتے ہیں۔ البتہ عمارات کی شان و شوکت ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر فوراً خاص و عام کے دل پر پڑتا ہے۔ سرسیّد کا یہ خیال جہاں تک دیکھا جاتا ہے بالکل صحیح نکلا۔ فی الواقع کالج کی عظمت کا خیال باوجود سخت مخالفتوں کے جس قدر سرعت کے ساتھ تمام ملک میں

پھیل گیا یہ زیادہ تر اس کی شاندار عمارتوں کا نتیجہ تھا۔ خصوصاً گورنمنٹ اور انگریزوں کی نظر میں جن کی توجہ اور التفات سے کالج کو نہایت فائدہ پہنچا ہے اس کی وقعت بہت کچھ اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جبکہ ایجوکیشن کمیشن نے علی گڑھ میں اپنا اجلاس کیا تھا اور اس وقت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسٹر وارڈ نے جو کمیشن کی لوکل کمیٹی کے ممبر تھے، علی گڑھ کے ہندوؤں کے ایڈریس کے جواب میں بورڈنگ ہاؤس محمڈن کالج کی پختہ بارک کی نسبت یہ الفاظ کہے تھے کہ:

''جس وقت میں نے کمروں کی اس قطار کو دیکھا جو بعد مکمل ہونے کے تمام دنیا میں شاید اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارت ہوگی، تو مجھ کو اس بات کا خیال ہوا کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر آئندہ کی نسبت نئی ہمت پیدا نہ ہو۔'' میرے ایک عزیز دوست جو ولایت میں تعلیم پا کر آئے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ''انگلستان کے نامور سیاح ریورنڈ کین بارنٹ جب چین، جاپان اور امریکہ کی سیاحت کے بعد لندن میں آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے کہیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے کالجوں کے نمونہ کا کالج سوائے محمڈن کالج کے کہیں نہیں دیکھا۔''

سرسیّد کو کالج کی زیادہ شاندار عمارتیں بنانے کا خیال اس نظر سے بھی ضرور ہونا چاہیے تھا کہ آئندہ نسلوں کو اپنے قومی انسٹی ٹیوشن کی عظمت وشان دیکھ کر اس کے قائم رکھنے کا زیادہ خیال ہو۔ ایشیائی قوموں میں برخلاف اہل یورپ کے یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا کہ اگلوں نے جو کام ادنیٰ درجہ کی حالت میں چھوڑا ہے اس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں۔ یا جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں ان کو پورا کر دیں۔ ہم ایسے بہت سے مدرسے اور خانقاہیں نشان دے سکتے ہیں جن کے بانی ان کو ناتمام چھوڑ کر مر گئے۔ اور وہ چند روز میں کھنڈر ہو گئیں۔ لیکن اکثر اوقات عمارت کی عظمت اور شان ان ملکوں میں بھی لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ اس کو جس طرح ہو سکے قائم اور آباد رکھیں۔ ہم کو سٹریچی ہال کی نسبت جب کہ وہ بالکل مرتب و تیار ہو چکا تھا ایک معزز مسلمان کا یہ کہنا یاد رہے گا کہ:

''جب تک یہ عمارت قائم ہے مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی ایسے کام کر گزرتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔''

بہرکیف اس انسٹی ٹیوشن کے قائم و برقرار رہنے کی اگر کچھ امید کی جا سکتی ہے تو انہی عمارتوں کی بدولت ہو سکتی ہے جن کی نسبت کمیٹی نے گورنمنٹ سے یہ اقرار لیا ہے کہ اگر (خدانخواستہ) کالج بند ہو جائے تو تمام عمارتیں گورنمنٹ کے قبضہ میں چلی جائیں۔

سرسیّد نے ان عمارتوں میں آئندہ نسلوں کے فخر و مباہات کیلئے ایک نہایت موثر طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ تمام سنگین اور پختہ عمارتوں پر ان کے بانیوں کے اور کالج کے محسنوں، مربیوں اور مددگاروں کے نام جن میں زیادہ تر مسلمان ہیں، بڑے اہتمام سے کندہ کرائے ہیں۔

سنا ہے کہ کالج کے احاطہ کی جالیوں پر مسلمانوں کے نام کھدے ہوئے دیکھ کر ایک یورپین افسر نے کہا تھا کہ:

''یہ احاطہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ گویا مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے، اس کالج کو چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں کہ کوئی آفت اس پر نہ آنے پائے۔''

کتبوں کے علاوہ اور بھی بہت سی ایسی باتیں ان عمارتوں میں ملحوظ رکھی گئی ہیں جن سے مسلمانوں کے دل میں کالج کی طرف ایک کشش پیدا ہو۔ مثلاً محرابیں سیر سنک سٹائل پر بنوائی گئی ہیں یا بورڈنگ ہاؤس کے صدر دروازہ کی پیشانی پر کھجور کا درخت جو عرب کی خصوصیات میں سے ہے اور ہلال و تاج کا نشان جو مسلمانوں کا برٹش حکومت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہے ثبت کرایا گیا ہے۔ اکثر انگریزوں کی سپیچیں، جن میں مسلمانوں کو غیرت اور ان کے اسلاف کی عظمت یاد دلائی گئی ہے، جا بجا پتھروں پر کندہ کرا دیں۔ جن یورپین افسروں اور حاکموں نے کالج کی مدد کی ہے ان کی عالیشان یادگاریں بنوائی گئی ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کو آئندہ زمانہ میں اس بات پر فکر کرنے کا موقع ملے کہ ان کے اسلاف اپنے محسنوں کے کیسے شکر گزار اور دل سے قدر کرنے والے تھے۔

بعض ممبروں کی یہ رائے تھی کہ تعمیر کیلئے ماہواری یا سالانہ ایک رقم معین ہونی چاہیے کہ اس سے زیادہ کبھی صرف نہ ہونے پائے۔ بے شک یہ ایک نہایت سلامت روی کی چال تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو سرسیّد نے جو ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے، یہ ہرگز ظہور میں نہ آتا۔ اور کالج کی وقعت جو دفعتاً تمام زمانہ کے دل میں پیدا ہو گئی اس کیلئے ایک مدت دراز تک انتظار کرنا پڑتا اور سرسیّد کے بعد کسی سے یہ امید نہ تھی کہ تعمیر کا کام ایسے چاؤ اور امنگ سے سرانجام کرتا جیسے کوئی اپنا محل تیار کراتا ہے۔ حالانکہ ایسے لوگوں کا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا نادرات سے ہے۔ باوجود اس کے انہوں نے اس قطعہ زمین کے آباد و سرسبز کرنے میں فوق العادت کوشش اور توجہ کی ہے۔ برسوں بلا ناغہ دوپہر اور تمام دن سخت سخت موسموں میں وہ خود مدد پر جا جا کر بیٹھے ہیں۔ اور اپنے سامنے راج مزدوروں اور سنگتراشوں سے کام لیا ہے۔ باوجود اس تن وتوش کے وہ کالج کے باغ کی تیاری میں پہروں دھوپ اور لوؤں میں پھرتے تھے، کنوئیں کھدواتے تھے، زمین ہموار کرتے تھے، ہل چلواتے تھے، روشیں بنواتے تھے، دور دور سے ہر قسم کے پودے منگواتے تھے جو ان کے روبرو باغ میں لگائے جاتے تھے۔ باوجود ان تمام باتوں کے تعمیر وغیرہ کے متعلق ہر کام ان کو اپنی رائے سے کرنا پڑتا تھا۔ نہ کوئی انجینئر یا اوورسیئر تھا جس سے صلاح لی جائے نہ کوئی لائق مستری تھا جس کی تجویز اور رائے پر اطمینان ہو۔ جن دیہاتی معماروں سے یہ کام لئے گئے انہوں نے کبھی اس قسم کی عمارتیں نہیں بنائی تھیں۔ اس لئے سرسیّد کو ہر ایک عمارت کا نقشہ خود ہی سوچنا پڑتا تھا۔ اور خود ہی اس کے عام نشیب و فراز سوچنے پڑتے تھے۔ معماروں اور سنگتراشوں کو خود بیٹھ کر ایک ایک بات بتانی پڑتی تھی۔ اور پھر جب تک وہ

کام ختم ہو خود ہی اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی کہ جس طرح بتایا گیا ہے اس طرح کا بنتا ہے یا نہیں۔
ہم نے سنا ہے کہ بعض یورپین انجینئروں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کو دیکھ کر تعجب ظاہر کیا ہے اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ بغیر کسی تعلیم یافتہ انجینئر کی صلاح اور مشورہ کے یہ عمارتیں تیار ہوئی ہیں تو وہ اور بھی زیادہ متعجب ہوئے ہیں۔ بایں ہمہ ممکن ہے کہ ان عمارتوں میں انجینئرنگ کے اصول کے موافق یا طلبہ کے آرام و آسائش کے لحاظ سے کوئی کمی یا نقص رہ گیا ہو لیکن ہم کو اس قومی انسٹی ٹیوشن کیلئے ایسا انجینئر ملنا ناممکن تھا جو خود ہی تعمیر کیلئے روپیہ فراہم کرے، خود ہی عمارت بنوائے، ایک کوڑی تنخواہ کی نہ لے، نہایت دیانت داری سے اپنا کام انجام دے اور ہر ایک عمارت کو ایسے شوق سے بنوائے کہ گویا اپنا گھر بنواتا ہو۔
بعض لوگ کہتے ہیں کہ تعمیر پر جتنا روپیہ صرف ہونا چاہیے تھا اس سے بہت زیادہ صرف ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی عمارتیں بنانی کیا ضروری تھیں؟ بعض کہتے ہیں کہ بیسیوں عمارتیں ناتمام پڑی ہیں۔ ان کے شروع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس قدر روپیہ آتا جاتا اسی قدر عمارتیں بنتی جاتیں۔ بعض اور اور اعتراض کرتے ہیں۔ مگر افسوس کہ نہ انہوں نے خود کسی قومی عمارت کا نمونہ اس سے بہتر بنا کر دکھایا اور نہ کوئی ایسی عمارت نشان دیتے ہیں جو قوم سے بھیک مانگ کر اس سے بہتر کسی نے بنائی ہو۔

مشکلے دارم زدانشمند مجلس باز پرس
کار فرمایاں چرا خود کار کمتر می کنند

عمارت کے متعلق اخیر بات جو سرسیّد کی لائف میں ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ سرسیّد نے باوجود اس کے کہ کالج کے بانی ہونے کا فخر درحقیقت انہی کو حاصل تھا، ہمیشہ اس بات سے انکار کیا ہے کہ کالج میں ان کے نام کا کوئی کتبہ یا نشان خصوصیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔ جب اول ہی اول کالج کے قائم ہونے کی تجویز ہوئی تو ان کے دوستوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ کالج کا نام مدرسہ احمدیہ رکھا جائے۔ بلکہ کلکتہ کے اخبار گائیڈ نے ایک دفعہ یہ نام اپنے پرچہ میں چھاپ بھی دیا۔ مگر سرسیّد نے اس کی سخت مخالفت کی۔ اور ہرگز اس بات کو منظور نہیں کیا کہ کالج ان کے گائیڈ سے موسوم کیا جائے۔ اس کے بعد ۱۸۸۱ء میں آنریبل حاجی محمد اسماعیل خان نے سرسیّد کی اطلاع اور مرضی کے بغیر ایک عمارت ان کی یادگار میں بنانے کیلئے چندہ کھولا اور کالج کا دروازہ ان کی یادگار میں بنانا اور اس پر سرسیّد کے نام کا کتبہ لگانا تجویز کیا۔ انہوں نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ مسلمان جن سے میری یادگار کا چندہ آپ وصول کرنے کی امید رکھتے ہیں، ان کی نظر اور میرے کاموں کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ پس آپ چندہ کس سے وصول کریں گے۔ مگر جب حاجی صاحب نے کسی طرح نہ مانا تو سرسیّد دو شرطوں پر راضی ہوئے۔ ایک یہ کہ دروازہ کی پیشانی پر جو کتبہ لگایا جائے اس پر یہ لکھا جائے کہ قوم نے بھلائی کیلئے یہ کالج بنایا ہے۔

دوسرے یہ کہ کتبہ دروازہ کے اندرونی جانب لگایا جائے اس پر مولوی سمیع اللہ خان اور حاجی اسماعیل خان کا نام بھی جو اس عمارت کے بنانے کے محرک ہوئے ہیں، کندہ کرایا جائے۔ حاجی صاحب نے شرط تو بہ کراہ قبول کر لی، مگر دوسری شرط کی نسبت یہ کہا کہ آج تک کہیں ایسا نہیں سنا گیا کہ کسی خاص شخص کی یادگار میں اوروں کی نام بھی شریک کئے جائیں۔ سرسیّد نے کسی طرح نہ مانا اور دونوں شرطیں قبول کرنی پڑیں۔ چنانچہ دروازہ کے پیش طاق پر چند عربی اشعار کندہ کرائے گئے جن میں کسی خاص شخص کے نام کی تصریح نہیں ہے۔ اور اندرونی جانب حاجی محمد اسماعیل خان اور مولوی سمیع اللہ خان کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔

قطع نظر اس کے کہ حاجی صاحب کے اصرار نے سرسیّد کو مجبور کر دیا تھا، بڑی وجہ سرسیّد کے راضی ہو جانے کی یہ تھی کہ ان کو اپنی یادگار کے حیلہ سے احاطہ بورڈنگ ہاؤس اور کالج کا صدر دروازہ جو ایک نہایت ضروری عمارت تھی اور بورڈنگ ہاؤس کے چھ پختہ کمرے تیار نظر آتے تھے جن کا بغیر اس حیلہ کے تیار ہونا نہایت دشوار تھا۔ چنانچہ ۲۶ جون ۱۸۸۱ء کے جلسہ کمیٹی یادگار سیّد احمد خان میں مولوی سیف فرید الدین خان نے صاف کہا تھا کہ اگر حاجی صاحب اس چندہ سے بورڈنگ ہاؤس کی ایک ضروری عمارت کا بنانا تجویز نہ کرتے تو سیّد احمد خان اس کی شدید مخالفت کرتے۔

اسی طرح ایک دفعہ کالج کے بعض یورپین پروفیسروں نے یہ تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فاؤنڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کئے جایا کریں۔ سرسیّد نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ:

> ''ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے، اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو، اس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کی جائے۔ اس لئے میرے نزدیک بجائے فاؤنڈرز ڈے کے، فاؤنڈیشن ڈے (یعنی کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے۔''

چنانچہ اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسیّد نے کس لئے اپنی یادگاری قائم کرنے کی مخالفت کی تھی؟

تمام دنیا میں اور خاص کر ان ملکوں میں جہاں ہمیشہ ایسے قومی رفاہ کے کام ہوتے رہتے ہیں، یہ عام دستور ہے کہ ہر قوم کے افراد ان لوگوں کی شکر گزاری کے طور جن سے کوئی قوم کی بھلائی کا کام ہوتا ہے ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ اور اس سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم کو ناشکری و احسان فراموشی کا دھبا نہ

لگے۔ اور آئندہ نسلوں میں بھی قوم کی خیر خواہی کا حوصلہ پیدا ہو۔ پھر کیا وجہ تھی کہ ایسے مفید کام کرنے سے سرسیّد لوگوں کو مانع آتے تھے؟

اس کا جواب بہت صاف ہے۔ جن ملکوں میں قومی بھلائی کے کام کرنے اور محض قوم کی خیر خواہی میں اپنی عمریں صرف کر دینے کا عام دستور ہے اور جہاں ہر زمانہ میں ایسی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں وہاں کبھی ایسے لوگوں پر جو ایسے کام کرتے ہیں خود غرضی کا گمان کسی کو نہیں ہوتا۔ بلکہ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ اور جاہل سے لے کر عالم تک سب دل سے ان کی عزت کرتے ہیں، ان کا احسان مانتے ہیں، ان کو مدد دیتے ہیں اور ان کی شکر گزاری اور آئندہ نسلوں کا دل بڑھانے کیلئے ان کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک کا حال اس کے برخلاف ہے۔ یہاں ایسی مثالیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں کہ کوئی شخص بے شائبہ غرض محض قوم کی بھلائی میں اپنی عمر صرف کر دے، رات دن اسی ادھیڑ بن میں لگا رہے اور قوم ہی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا لے۔ اس لئے اگر حسن اتفاق سے قرنوں اور صدیوں کے بعد کوئی ایسا شخص پیدا ہو جاتا ہے تو اس کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جس قسم کے کام کا وہ ارادہ ظاہر کرتا ہے اس کا نمونہ قوم میں موجود نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کو اپنی طرف سے بدگمانی کے رخنے بند کرنے پڑتے ہیں۔ تاکہ قومی رفاہ کے کام میں خلل واقع نہ ہو۔ اور لوگ اس کا ذاتی کام سمجھ کر امداد اور اعانت سے پہلو تہی نہ کریں۔ چنانچہ ایک آدھ موقع پر اگر کسی وجہ سے سرسیّد اس مصلحت کا لحاظ نہ کر سکے تو نہ صرف ان کے مخالف بلکہ نہایت عزیز دوست ان کی طرف سے کھٹک گئے۔ اور طرح طرح کی بدگمانیاں لوگوں میں پیدا ہو گئیں۔

وائسرائے کاؤنسل کی ممبری

سرسیّد کو لارڈ لٹن نے ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی قانون ساز کاؤنسل کا ممبر مقرر کیا تھا۔ ان کے بعد دوسری بار لارڈ رپن نے کاؤنسل کا ممبر نامزد کیا۔ کاؤنسل میں ہندوستانی ممبروں کی ممبری کی تحریک بھی سب سے پہلے سرسیّد ہی نے پیش کی تھی۔

حالی: سیّد صاحب! کاؤنسل کی ممبری کے دوران آپ نے کیا کیا؟

سرسیّد: میں مستقل چار سال وائسرائے کی قانون ساز کاؤنسل کا ممبر رہا۔ اس عرصہ میں ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے قانون کے دو مسودے کاؤنسل میں پیش کئے۔

حالی: کون سے؟

سرسیّد: چیچک کے ٹیکہ کا قانون (۱۸۷۹ء) اور قاضیوں کے تقرر کا قانون، یہ دونوں مسودے پاس ہو گئے تھے۔ شکر ہے کہ اس وقت سے آج تک ان کے موافق ہندوستان کے اکثر حصوں میں عمل درآمد چلا آتا ہے۔

(حیاتِ جاوید، حالی، صفحہ ۲۲۲)

سرسیّد کا ذہن منطقی تھا۔ ہر چیز کو دلیل سے پیش کرتے تھے۔ چیچک کا مسودۂ قانون انہوں نے ۱۸۷۹ء میں پیش کیا تھا۔ اس ضمن میں حالی لکھتے ہیں:

''چیچک کے ٹیکے کا قانون جس کا مسودہ ستمبر ۱۸۷۹ء میں کاؤنسل میں پیش ہوا، اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ ٹیکے کا قاعدہ اضلاع شمال مغرب، اودھ، ممالک متوسطہ، برٹش برہما، آسام اور کورگ میں نیز فوجی چھاؤنیوں میں لازمی کر دیا جائے۔ چونکہ ایسا جبری قانون جاری کرنے سے رعایا کی شخصی آزادی میں ایک نوع کی مداخلت کرنی پائی جاتی تھی۔ اس لئے سرسیّد نے مسودہ پیش کرتے وقت جو اس پر ایک لمبا ریمارک کیا تھا اس میں اس قانون کے جاری کرنے کی ضرورت بہت خوبی سے ثابت کی اور بتایا کہ ''شخصی آزادی کی رعایت اس مضرت کو جائز نہیں رکھ سکتی جو مرض چیچک متعدی ہونے سے اوروں کو پہنچتی ہے۔ نیز چیچک کا ضرر بالخصوص ان بے گناہ بچوں کو پہنچتا ہے جو اپنی جانوں کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔ پس ٹیکے کے لازمی کر دینے سے جس طرح بڑی عمر کے آدمی ہمسایوں کی جہالت یا بے پروائی کے مضر نتائج سے محفوظ رہیں گے اس طرح معصوم بچوں کی جانوں کی حفاظت ان کے والدین کی بے وقوفی کے نتائج سے عمل میں آوے گی۔''

پھر یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ''جس طرح پہلے زمانہ میں لوگ عموماً ٹیکے سے ڈرتے تھے اب ایسا حال نہیں رہا۔ اب ملک میں ایک بہت بڑی جماعت تعلیم یافتہ لوگوں کی ایسی موجود ہے جو ٹیکے کا لازمی ہونا پسند کرتے ہیں۔''

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۲۲۳)

وقف علی الاولاد

حالی: سیّد صاحب! سنا ہے کہ آپ نے وائسرائے کی ممبری کے زمانہ میں ایک مسودہ قانون وقف خاندانی بھی پیش کیا تھا؟

سرسیّد: پیش نہیں، تیار کیا تھا۔ جس سے مسلمان خاندانوں کو تباہی اور بربادی سے بچانا تھا۔

حالی: وہ کیسے؟

سرسیّد: میں دیکھ رہا تھا کہ مسلمان خاندانوں کی حالت روز بروز تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔ جو امیر اور ذی مقدور خاندان تھے ان کی اولاد مفلس ہوتی جاتی ہے اور جن میں ابھی کچھ جان باقی ہے، دو تین پشتوں کے بعد ان کی جائیدادیں اور ریاستیں بھی سب برباد اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور قرضہ میں فروخت ہو جائیں گی۔ اس لئے مجھ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے مسلمانوں کے معزز خاندان بنے رہیں۔ اور ان میں کچھ ایسے

ذی مقدور اور رئیس دکھائی دیں جس سے مسلمانوں کی قوم کی عزت اور امتیاز قائم رہے۔

اول انہوں نے نہایت محنت و جانفشانی سے سنی اور شیعہ، دونوں کی فقہی کتابوں سے اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی جائیداد کو اپنے لئے اور اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کیلئے ہمیشہ کو وقف کر دے، جس کی رو سے وہ جائیداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ پھر جہاں جہاں ہندوستان میں مسلمان رئیسوں نے اپنی جائیدادیں اس طرح اپنے خاندان کیلئے وقف کی تھیں ان کی بہت سی مثالیں بہم پہنچائیں۔ تاکہ مسلمانوں کے عمل درآمد سے مسئلہ شرع کو اور بہت زیادہ تقویت ہو۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ جو لوگ خانگی طور پر، بلامداخلت سرکاری، اپنی جائیداد اور خاندان کے لئے وقف کرتے ہیں ایسے وقف سے کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اول تو یہ امید نہیں کہ وہ جانشینی کا ایسا قاعدہ کلیہ مقرر کر سکیں جس میں آخر کار الجھن پیدا نہ ہو اور نزاع کا احتمال باقی نہ رہے، دوسرے اس صورت میں ہمیشہ وقف کے فرضی اور جعلی ہونے کا الزام لگا۔ اس کی منسوخی کے دعوے جیسا کہ اکثر ہوتا رہا ہے، عدالت میں دائر ہو سکتے ہیں۔ تیسرے چونکہ اکثر جائیدادیں مالگزاری سرکار ہوتی ہیں اس لئے جب کوئی نالائق متولی جانشین زر مالگزاری سرکار ادا نہیں کرتا تو امر شرعی یا قانونی اس بات کا مانع نہیں ہوتا کہ وہ جائیداد بعلت بقایا جات سرکاری نیلام ہو جائے۔ اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ یہ مسئلہ شرعی بذریعہ ایک قانون کے گورنمنٹ کی منظوری سے استحکام پا جائے۔

اس غرض سے انہوں نے ایک مسودہ نہایت لیاقت کے ساتھ تیار کیا اور کاؤنسل میں پیش کرنے سے پہلے وائسرائے سے پرائیویٹ طور پر اس کے مشتہر کرنے اور مسلمانوں کی رائیں اس کی نسبت دریافت کرنے کی اجازت لے کر تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات میں مشتہر کرایا۔ بہت سے مسلمانوں نے خطوں کے ذریعے اس کے ساتھ اتفاق ظاہر کیا۔ بعض شہروں میں وہاں کے رئیسوں اور ممتاز لوگوں نے جلسے کئے اور اس تجویز کو پسند کیا۔ بعض نہایت مستند عالموں نے وقف خاندانی کے مسئلہ کو تسلیم کیا اور اس کے جواز پر فتویٰ لکھ دیا۔ مگر بہت سے مسلمانوں نے اور خاص کر مولوی ابوسعید عظیم آبادی اور ان کے پیرووں نے سخت مخالفت کی۔ چنانچہ وقف خاندانی کے عدم جواز پر فتوے لکھے گئے۔ اور گورنمنٹ میں اس کے برخلاف عرضیاں اور میموریل بھیجی گئی۔

جس زمانہ میں اس مسودہ کے برخلاف مولویوں کے فتوے شائع ہو رہے تھے کسی انصاف پسند مسلمان نے ان فتووں کے خلاف آرٹیکل لکھا تھا جس کا پہلا فقرہ یہ تھا۔

''انگلستان کا ایک مصنف لکھتا ہے کہ جو شخص اپنے ملک یا اپنی قوم کا بدخواہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ دنیا میں ایک عجب چیز ہے۔''

''ہم کہتے ہیں کہ یہ مصنف چونکہ یورپ میں پیدا ہوا تھا اس لئے شاید اس نے عمر بھر میں کوئی

قوم کا بدخواہ نہ دیکھا ہوگا۔ اور اسی لئے وہ قوم کے بدخواہ کو ایک عجیب چیز سمجھتا تھا۔ لیکن اگر وہ ہماری قوم میں پیدا ہوتا تو بجائے اس قول کے شائد یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتا کہ جو مسلمان مولوی ہو کر اپنی قوم کا بدخواہ نہ ہو اس کی زیارت کرنی چاہیے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی چیز اس سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔''

بہرحال سرسیّد نے یہ تدبیر مسلمان رئیسوں کیلئے نہایت عمدہ سوچی تھی مگر افسوس کہ وہ اس مسودہ کا ؤنسل میں پیش نہ کر سکے۔ نہ اس لئے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ قانون لازمی نہ تھا اور اس کی پابندی محض مالک جائیداد کی مرضی پر منحصر تھی۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اصول قانون کی رو سے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ یا یہ ہے کہ وہ قانون بالکل فریقین کی روایات فقہ کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا۔ اور فقہ کی رو سے ضرور تھا جو وقف اس طرح اولاد کیلئے کیا جائے وہ وقف دائمی ہو نہ کہ میعادی۔ مگر ولایت کے مفتیوں کے یہ رائے قطعی طور پر قرار پا چکی تھی کہ کسی جائداد کو ہمیشہ کیلئے ناقابل انتقال بنا دینا ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس سرسیّد کے بعض دوستوں نے جو کاؤنسل میں تھے، ان کو یہ صلاح دی کہ موجود صورتحال میں مسودہ قانون پیش کرنا عبث ہے۔ کیونکہ اس کے منظور ہونے کی امید نہیں۔ ہاں اگر وقف کی کوئی میعاد مقرر کر دی جائے تو البتہ یہ قانون پاس ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ایسے وقف کو میعادی قرار دینا شرعاً جائز نہ تھا۔ اس لئے لاچار اس سے دست بردار ہونا پڑا۔

سرسیّد نے ان تینوں مسودوں کے تیار کرنے کے سوا اور اکثر موقعوں پر جب تک وہ کاؤنسل میں ممبر رہے غیر معمولی لیاقت ظاہر کی۔ باوجود انگریزی نہ جاننے کے ہر ایک اہم معاملہ پر جو کاؤنسل میں پیش ہوتا تھا، وہ گفتگو کرتے تھے۔ اور اس لئے ان کو تمام کاغذات جو اس معاملہ سے متعلق اور بالکل انگریزی میں ہوتے تھے، سمجھنے پڑتے تھے۔ اور اس طرح کافی اطلاع حاصل کرنے کے بعد وہ کاؤنسل میں سپیچ کرتے تھے۔ اکثر چھوٹی چھوٹی سپیچیں وہ اول خود اردو میں لکھ کر ان کا انگریزی میں ترجمہ کراتے تھے۔ اور پھر انگریزی الفاظ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر کاؤنسل میں سپیچ دیتے تھے، اور بڑی بڑی اسپیچیں، جو وہ تیار کر کے لے جاتے تھے، ان کو اکثر کاؤنسل کا سیکرٹری پڑھ کر سناتا تھا۔ ان کی ایک سپیچ جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی تھی۔ لارڈلٹن نے بڑا تعجب ظاہر کیا تھا۔ سرسیّد کہتے تھے کہ:

''جب میں اجلاس ختم ہونے کے بعد کاؤنسل کے ہال سے اپنے کمرے کی طرف چلا تو لارڈلٹن بھی پیچھے پیچھے چلے آئے۔ اور مہربانی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے کہ میں نے ایسی قابلانہ سپیچ کبھی نہیں سنی تھی۔ سپیچ غالباً مسودہ قانون مزارعان دکن پر تھی۔ جس کا انتخاب کرنل گریہم نے سرسیّد کی لائف میں چھاپ دیا ہے۔''

ایک اور سپیچ مسودہ قانون انتقال جائیداد کی رپورٹ پیش ہونے پر سرسیّد نے ۲۶ جنوری

۱۸۷۲ء کو بل کی تائید میں کی تھی۔ اس بل پر ''انگلش مین'' میں ایک لمبا آرٹیکل چھپا تھا جس میں سر سیّد کی سپیچ کی نسبت لکھا تھا کہ:

''کسی ہندوستانی جنٹلمین نے اب تک اس مسئلہ کی تائید میں کہ ملک کا قانون کوڈیفیکیشن (یعنی مجموعۂ احکام بنانے) کا محتاج ہے۔ اور اس میں کوڈیفیکیشن کی گنجائش ہے اور ملک کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے، ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی ہے جیسی آنریبل سیّد احمد خان نے کی ہے۔''

اسی طرح قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطہ فوجداری جو ہندوستان میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ نیز دیگر قوانین پر انہوں نے بہت باوقت سپیچیں کی ہیں۔ خصوصاً وہ سپیچ جو قانون لوکل سیلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسطہ ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ لٹن کے زمانہ میں کی تھی، وہ خاص توجہ کے لائق ہے۔

پنجاب کا دورہ

جنوری ۱۸۸۴ء میں سرسیّد اپنے رفقاء کے ساتھ پنجاب کے دورے پر نکلے۔ لدھیانے میں ان کا پہلا لیکچر ہوا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی کی تصویر انہوں اس دلسوزی سے کھینچی کہ لوگ تڑپ اٹھے۔ آخر میں کہا:

''اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو۔ ان کی پرورش کرو، ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو۔ مجھ کو کچھ بھی کہو، میری بات سنو یا نہ سنو، مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت کو دیکھو گے اور بے چین ہو گے، روؤ گے اور کچھ نہ کرسکو گے۔ تم اگر مرجاؤ گے تو اپنی اولاد کی خراب زندگی دیکھ کر تمہاری روحیں قبروں میں تڑپیں گی اور تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ ابھی وقت ہے اور تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ مگر یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو، ان کی تربیت کرو، مگر تم سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ (چیئرز) مجھ کو کچھ کہو، کافر، ملحد، نیچری۔ میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواست گار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، تمہارے بچوں کی بہتری کیلئے کہتا ہوں۔ تم انہی پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(بڑے زور کی چیئرز)

اسلام اور قومی ترقی

۱۸۸۴ء میں اپنی تعلیمی تحریک کو عام کرنے کے سلسلے میں لدھیانے گئے تھے۔ وہاں مسلمانوں کا کوئی سکول نہ تھا۔ مسلمان بچے مشن سکول میں پڑھتے تھے۔ وہاں ایک تقریب میں ایک نوجوان معین الدین احمد نے ان کی خدمت میں ایک سپاسنامہ پیش کیا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مسلمان بچے مشن سکول میں پڑھتے ہیں، اس خیال سے کہیں وہ اسلام سے دور نہ ہو جائیں۔ سرسیّد نے سپاسنامہ کے جواب میں کہا:

''تمہارے بیان میں کئی جگہ پر قوم کا لفظ آیا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے کہ جب

تک وہ قوم، قوم نہ رہے۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے، وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے عزیز مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تب ہی تک وہ قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام، جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے، اس کو قائم رکھنے ہی سے ہماری قوم، قوم ہے۔

اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا؟ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ امید ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قائم رکھو گے کہ یہی قومی ترقی ہو گی، جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت دے گی۔ اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاویں گی۔"

(چیئرز نہایت جوش سے)

(سرسیّد احمد خان پنجاب میں، مولوی سیّد اقبال علی، صفحہ ۳۶-۳۵)

آپ پہلے برا کہتے تھے، اب اچھا، آپ کا شکر گزار ہوں

جنوری ۱۸۸۴ء میں سرسیّد اپنے رفقاء کے ساتھ پنجاب کے دورے پر نکلے تھے۔ مولوی سیّد اقبال علی جو اس سفر میں سرسیّد کے ساتھ تھے، کہتے ہیں:

"اس مجمع میں ایک بزرگ سن رسیدہ بھی موجود تھے، جو پہلے سرسیّد صاحب کو بہت برا بھلا کہا کرتے تھے۔ انہوں نے سرسیّد کو جو دیکھا اور ان کی خدا لگتی باتیں سنیں تو دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوئے۔ پھر اٹھ کر ان کے پاس گئے۔"

بزرگ: (رو کر) آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میں ناواقفیت کی بناء پر آپ کو بہت برا بھلا کہتا رہا ہوں۔ آج میری آنکھیں کھلی ہیں۔

سرسیّد: (ان سے فروتنی سے مصافحہ کرتے ہوئے) آپ میرے بزرگ ہیں، آپ اس طرح نہ روئیں، شرمندہ نہ ہوں، مجھے اس کا کچھ خیال نہیں ہے۔ آپ کو قوم کا درد ہے، میرے لئے یہی بہت ہے۔

(سرسیّد احمد خان پنجاب میں، مولوی سیّد اقبال علی، صفحہ ۲۷)

اپنی تعلیم اپنے ہاتھ میں

سرسیّد نے مسلمانوں کو ذلت و تباہی کے بھنور سے نکالنے کا ایک ہی علاج سوچا تھا یعنی مسلمانوں میں جدید تعلیم کی ترویج اس تحریک کا آغاز انہوں نے ۱۸۶۰ء کے عشرے میں کیا تھا۔ اس مشن

کو آگے بڑھانے کیلئے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اور کیسے کیسے صبر آزما مرحلوں سے نہ گزرے۔ بالآخر جو سوچا تھا، اسے کر کے چھوڑا۔ لیکن آخر میں وہ اس کے نتائج سے مطمئن نہ تھے۔

۱۸۹۴ء میں جب ہو پنجاب کے دورے پر نکلے تو اہل پنجاب نے بہ مقام جالندھر انہیں ایڈریس دیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے صاف صاف کہا:

''یونیورسٹیوں کی مثال اور ہمارے کالج کے لڑکوں کی مثال آقا اور غلام کی سی ہے۔ ہم یونیورسٹی کے تابع ہیں اور اس کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں۔ جو ٹکڑا علم کا دیتی ہے اسی کو کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔ اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔

اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہو گی جب ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی، یونیورسٹیوں کی غلامی سے آزاد ہوں گی، ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے، بغیر یونیورسٹیوں کی غلامی کے، ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے، فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر!

یونیورسٹی کی تعلیم ہمیں خچر بناتی ہے۔ میں خود انہی میں ہوں۔ کیونکہ مجھے بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری دی ہے۔ ہم آدمی جبھی ہوں گے جب تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہو گی۔''

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۷۳)

قومی تھیٹر بنائیں تو کیسا ہو؟

جنوری ۱۸۸۴ء میں سرسیّد پنجاب کے دورے پر نکلے تھے۔ امرتسر میں مدرسہ اسلامیہ کے استادوں کے سپاسنامہ کے بعد سرسیّد نے ایک تھیٹر کا حال بھی دیکھا۔ بقول سرسیّد کے، بہتر باتوں، کارخیر کے کاموں کے لئے وہاں کا یورپین سٹاف سوانگ بھرتا تھا، نقلیں اتارتا تھا۔ اس طرح کافی روپیہ خیراتی کاموں کے لئے جمع ہو جاتا تھا۔

سرسیّد کو چندہ جمع کرنے کا یہ طریقہ پسند آیا۔ ان کے تخلیقی ذہن نے اس سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنالیا۔ مولوی سیّد اقبال علی جوان کے ہمرکاب تھے، اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

''ہم نے مدرستہ العلوم کیلئے روپیہ جمع کرنے کی ہر طرح پر کوشش کی، امیروں سے التجا کی، والیان ملک سے درخواست کی، قوم سے بھیک مانگی، غیرت کو طاق پر رکھا اور غیر قوموں کے سامنے گداگری کے لئے ہاتھ پھیلایا، لاٹری کا جُوا کھیلا۔ مگر پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ قوم کی اور ملک کی حالت یہ ہے کہ کھیل تماشے، ناچ رنگ، مسخراپن سے روپیہ وہ دیتے ہیں۔ پس اگر کالج کمیٹی کے ممبر بھی مل کر ایک تھیٹر بنائیں اور خود مقدس ممبر اس میں گانے والے اور تماشا کرنے والے ہوں تو صرف تین چار شہروں میں تماشا کرنے سے کافی روپیہ ہاتھ آجاوے۔ انہوں نے فرمایا کہ خیال کرو کہ جب ہماری یہ، قومی تھیٹر کی پارٹی کسی شہر میں پہنچے اور اشتہار دیا جاوے کہ مولوی سمیع اللہ خان بہادر سب جج علی گڑھ اس طرح کا سوانگ بھریں گے اور مولوی سیّد فرید الدین احمد خان بہادر سب جج کانپور یوں یوں روپ بدلیں گے، مولوی سیّد زین العابدین خان بہادر، جج آگرہ اس طرح ٹھٹھول کریں گے، مولوی سیّد مہدی علی خان منیر نواز جنگ بہادر ریونیو سیکرٹری گورنمنٹ نظام حیدرآباد یہ غزل گاویں گے، مولوی مشتاق حسین صاحب ممبر صدر بورڈ ریونیو حیدرآباد کے ہاتھ میں دُرّہ ہوگا اور محتسب کا سوانگ بھریں گے اور لوگ تکرار کریں گے کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار'' منشی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر میور سنٹرل کالج الٰہ آباد ''چہ غم'' کا تماشا دکھاویں گے، مولوی سیّد اقبال اس طرح سے ہنس مکھ جوانِ رعنا کا سوانگ بھریں گے، مولوی سیّد مہدی حسن صاحب ''دیا فراموش'' کی نقل کریں گے اور سیّد میر تراب علی صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ایٹہ پھواڑ بڑھیل

کے روٹھ بیٹھنے کا تماشا کریں گے، مولوی خواجہ محمد یوسف صاحب وکیل علی گڑھ کفایت
شعاری کے ساتھ سوداگروں کی دکانوں اور نیلاموں کے مجمع میں اسباب خریدنے کی نقل
کریں گے، نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر پرستان کے بادشاہ بن کر آویں گے، وزیر
الدولہ مدبر الملک خلیفہ سید محمد حسن خان بہادر پرنس بسمارک کی نقل اتاریں گے، مولوی
الطاف حسین حالی اپنی مسدس گاویں گے اور فلاں صاحب یہ نقل کریں گے اور فلاں صاحب
وہ نقل کریں گے، ان صاحب کے گلے میں ڈھولک ہوگی اور وہ صاحب سارنگی بجاویں گے
ان کے ہاتھ میں مجیرے ہوں گے اور ان کے پاس دوتارا اور آنریبل سید احمد خان بہادر سی
ایس آئی بمصداق اس شعر کسی شاعر تجربہ کار کے کہ

او مسخرگی پیش کن و مطربی آموز
تا داد خود از کہتر و مہتر بستان

ہر ایک مجلس کے مسخرے ہوں گے تو کس قدر لوگ تماشا دیکھنے کو آویں گے۔ اور کس قدر

لوگوں نے بیان کیا کہ اس تھیٹر میں مسلمانوں کے قومی تنزل کی بھی نقل ہوتی ہے اور "مسدس
حالی" کے بند گائے جاتے ہیں۔ اس نقل میں ایک مقام نہایت موثر ہے جو لوگوں کے
دل پر بہت اثر کرتا ہے۔ ایک پردہ کھولا جاتا ہے جس میں سمندر لہریں مارتا ہوا اور ڈوبتا
دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت "مسدس حالی" کا یہ بند گایا جاتا ہے

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے
پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے
نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے
کوئی اس میں سوتا کوئی جاگتا ہے
جو سوتے ہیں وہ مست خواب گراں ہیں
جو بیدار ہیں ان پہ خندہ زناں ہیں

روپیہ ہاتھ آجاوے گا۔ اگر ہم لوگ ایسا کریں اور اس طرح پر اپنی قوم کی بھلائی کیلئے روپیہ جمع کریں تو دنیا میں کوئی قومی عزت ایسی نہیں ہے جو اس پارٹی کو نصیب نہ ہو اور عقبیٰ میں کوئی اعلیٰ رتبہ ثواب کا ایسا باقی نہ رہے جو یہ پارٹی حاصل نہ کرے۔"

(سرسیّد احمد خان پنجاب میں، صفحہ ۶۷۔۶۹)

قومی تھیٹر

۱۸۸۴ء میں جب سرسیّد قومی تعلیمی تحریک کو عام کرنے میں پنجاب کے دورے پر نکلے تو امرتسر میں انہوں نے قومی تھیٹر کا چرچا سنا جو مسلمانوں نے اس دور میں مقبول پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے انداز میں بنایا تھا۔ سرسیّد کے رفیق کار مولوی سیّد اقبال علی اپنی کتاب "سرسیّد احمد خان پنجاب میں" مطبوعہ ۱۸۸۴ء میں لکھتے ہیں۔

"امرتسر میں مسلمانوں نے بھی مثل پارسیوں کے تھیٹر بنایا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں عمدہ نقلیں ہوتی ہیں اور گانا بھی اچھا ہوتا ہے۔ تھیٹر بنانا اور مردوں کو عورتوں کے کپڑے پہنا کر عورت بنانا جیسے کہ پارسی تھیٹر والے کرتے ہیں، نہایت حماقت کی بات ہے۔ مثل مشہور ہے کہ

"جب ناچنے نکلے تو گھونگھٹ کاہے کا"

یا تو کوئی ایسی نقل ہو جس میں عورتوں کی نقل بنانے کی ضرورت ہو۔ ورنہ تھیٹر میں عورتوں کی جگہ عورتوں ہی کو ہونا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ امرتسر کے تھیٹر میں درحقیقت عورتوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

کوئی ان سے پوچھے کہ اے ہوش والو!
کس امید پہ تم کھڑے ہنس رہے ہو
برا وقت بیڑے پہ آنے کو ہے جو
نہ چھوڑے گا سوتوں کو اور جاگتوں کو
بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

گانے والا یا گانے والی ان بندوں کے گانے میں موقع بہ موقع اس جہاز کی طرف، جو ڈوبنے کو ہو رہا ہے، اشارہ کرتی جاتی ہے۔ اس کا ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔"

وہیں امرتسر میں ۱۸۸۴ء میں مولوی سیّد اقبال علی اور سرسیّد کے مابین تھیٹر کے موضوع پر یہ گفتگو ہوئی

مولوی اقبال علی: سیّد صاحب! یہاں امرتسر میں مسلمانوں کے قومی تھیٹر کا بہت چرچا ہے۔ میرا دل بھی چاہتا ہے کہ میں یہ تھیٹر جا کر دیکھوں۔

سرسیّد: میں فی نفسہٖ تھیٹر کے خلاف نہیں ہوں۔ ہر ملک میں کچھ تفریح کا سامان ہوتا ہے جس سے وہ لوگ جو اپنے دماغ کی قوت مفید اور عمدہ کاموں میں صرف کرتے ہیں، کسی وقت تفریح بھی حاصل کر سکیں۔ تھیٹر میں ایک لازمی امر یہ ہوتا ہے کہ نصیحت آمیز باتوں اور بداخلاقی کے عیوب دکھانے کے ساتھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بداخلاقی و بدتمیزی کی بھی

یاد دلاتی ہیں یا سکھاتی ہیں۔
پس تھیٹر ایسے ملک میں ہونا چاہیے کہ جہاں تعلیم نے اور سوسائٹی نے لوگوں کے دل پر ایسا اثر کر دیا ہو کہ ان کے دل پر پہلی قسم کی باتوں سے موثر اور دوسری قسم کی باتوں سے ذہول کرنے کے قابل ہوں۔ ہندوستان کی حالت ایسی نہیں ہے۔ یہاں مفید کام تو کوئی نہیں کرتا، پھر اگر تفریح ہو تو کیا فائدہ ہوگا؟ علاوہ اس کے دل میں نہایت مختلف اثر پیدا ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ پہلی قسم کی باتوں سے وہ موثر ہوں اور دوسری قسم کی باتوں سے ذہول کریں، وہ دوسری قسم کی باتوں سے موثر ہوتے ہیں اور پہلی قسم کی باتوں سے ذہول کرتے ہیں۔
سیّد صاحب نے فرمایا کہ میں قاہرہ، دارالسلطنت مصر میں تھا کہ ایک دن وہاں کے عجائب خانے کو، جس میں قدیم مصریوں کی نہایت قدیم چیزیں اور ممیاں موجود ہیں، دیکھنے گیا۔ اتفاقاً وہاں مصر کے ایک پاشا بھی، جن کا نام مصطفٰی تھا یا اور کچھ، تشریف لائے۔ اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے جو تھیٹر قائم کیا تھا اور اس کے لئے نہایت عمدہ عمارت بنوائی تھی اس کا ذکر ہوا۔ سیّد صاحب نے نہایت مختصر لفظوں میں کہا کہ پہلے ملک کی حالت درست کر لو تب تھیٹر بناؤ۔
(سر سیّد پنجاب میں، صفحہ ۱۰۱)

نمائش علی گڑھ میں تھیٹر

یہ باتیں اس وقت مذاحاً اور مذاقاً تھیں لیکن ۱۸۸۰ء میں انہوں نے عملی صورت اختیار کی۔
علی گڑھ کی نمائش ان اضلاع میں ہمیشہ سے پر رونق ہوتی تھی۔ قرب و جوار کے رؤساء ہی نہیں بلکہ اکثر وضیع و شریف دور دور سے اس کی سیر کو آتے تھے۔ سرسیّد نے تجویز کی کہ اس موقع پر ایک پینی ریڈنگ تھیٹر کیا جائے۔ بہت سے دوستوں نے اس سے اختلاف کیا کہ لوگ ملعون کریں گے اور اخبارات مذاق اڑائیں گے۔ مگر سرسیّد نے پرواہ نہ کی اور اس کا انتظام شروع کر دیا۔ مناسب موقع پر شامیانے لگائے گئے، ان کو آراستہ کیا گیا اور اشتہار دے دیا گیا۔ ۶ فروری روز چہار شنبہ تاریخ مقرر کی۔ ٹکٹ کی شرح پانچ، تین، دو اور ایک روپیہ تھی۔ ''سرسیّد تھیٹر اور ممتاز اصحاب کا ایکٹنگ'' چونکا دینے والا اشتہار تھا۔
اگرچہ اس ڈرامہ کے ایکٹر وہ نہ تھے جن کو سرسیّد نے تجویز کیا تھا البتہ وہ خود اور خواجہ یوسف ایکٹر کی حیثیت سے موجود تھے۔ ہارمونیم بجا، پردہ اٹھا اور پہلا سین نظر آیا۔ نواب حاجی محمد اسمٰعیل خان شیروانی، رئیس دتاولی ترکی لباس میں تلوار کمر میں لٹکائے ہوئے کپتان کی صورت میں ٹہل رہے تھے۔ بارہ

سپاہی (طلباء) وردی پہنے اور جھنڈی لئے ہوئے لئے ایک ایک کر کے سٹیج پر آ ئے۔ کپتان نے ہر ایک سے مختلف زبانوں میں اس کا پرول (Parole) پوچھا اور ہر سپاہی نے قوم و فلاح قوم رتبغاً للخیر حب الوطن، لوجہ اللہ، اسلام اور تعلیم وغیرہ کے الفاظ میں بتایا اور کپتان کے حکم سے اپنی اپنی جگہ ایستادہ ہو گئے۔

دوسرا سین۔ سپاہی رعب و داب کے ساتھ اپنی جگہ کھڑے تھے، کپتان ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں عربی وضع کا ایک ریشمی چغہ پہنے:

دیکھا تو وہاں بجاہ و تمکیں
آیا نظر ایک پیر دیریں
صورت میں عیاں جلال شاہی
چہرہ پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سفیدی
چٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں ایک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

کپتان نے حسب معمول سوال کیا لیکن جواب نہ پایا۔ وہ آگے بڑھے اور سینے پر جو کالج کا تمغہ لٹک رہا تھا اس کو دیکھ کر پہچانا کہ ''سرسیّد'' ہیں۔ اس حیرت انگیز سکوت پر سرسیّد نے کہا:

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! کون ہے جو آج مجھ کو اس سٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا۔ وہی جن کا دل جھوٹی شیخی اور جھوٹی مشیخیت سے بھرا ہوا ہے۔

آہ اس قوم پر، جو ان باتوں کو جن سے انسان کو شرم اور حیا اور غیرت ہونی چاہیے اپنی شیخی اور اپنے افتخار کا باعث سمجھے۔ آہ! اس قوم پر جو قوم کہ انسان کی بھلائی کے کاموں کو جو نیک نیتی سے نیکی کیلئے کئے جائیں بے عزتی کے کام سمجھے۔

آہ! اس قوم پر جو خدا کو دھوکا دینے کیلئے مکر یا پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقعہ کو اپنے منہ پر ڈالے مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچے۔

آہ! اس پر جو اپنی قوم کو ذلت ونکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسی بے شرمی اور بے حیائی کے کام کرے جس سے بے شرمی و بے حیائی بھی شرما جائے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم ونفرین کا کام سمجھے۔

اے رئیسو اور دولتمندو! تم اپنی دولت وحشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ گو قوم کیسی ہی حالتِ بک میں ہو ہمارے بچوں کیلئے بہت کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا بھی خیال تھا جو تم سے پہلے تھے۔ مگر اب انہی کے بچوں کی وہ نوبت ہے جن کیلئے آج ہم سٹیج پر کھڑے ہیں۔
اے صاحبان! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے۔ قوم مفلس ہو گئی ہے۔ قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہونے سے ذلیل و رذیل ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس سے قوم کے غریب بچوں کو اخراجات تعلیم میں اعانت پہنچے۔ مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی۔ خود لوگوں سے بھیک مانگی۔ بہت ہی ملی۔ والنٹیئر بنانے چاہے بہت ہی کم بنے۔ اور جو بنے ان سے بھی کچھ نہ بن آئی۔ پس آج میں اس سٹیج پر اس لئے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کیلئے کچھ کر سکوں۔
لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے اپنی قوم کے غریب بچوں کیلئے کیا کچھ کیا ہے، بڑے بڑے ڈیوکس اور ڈچز سٹیج پر آئے ہیں۔ اور غریبوں کی امداد کرنے سے عزت پائی ہے۔ اس وقت بھی یورپین لوگوں نے اپنی نیک دلی ثابت کی کہ باوجود ہم قوم نہ ہونے کے ہمارے شریک رہیں۔ اور تھوڑی دیر میں ہمارے یورپین دوست اور مسٹر کینڈی کلکٹر وافسر ضلع، نہیں نہیں، مسٹر کینڈی میرے دوست سٹیج پر آنے والے ہیں مگر ہندوستانیوں کا نہ وہ خیال ہے نہ وہ دل اور نہ وہ دلی نیکی جو ایسے کاموں کے باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان میں یہ پہلا موقع ہے جو میں اس قومی کام کیلئے سٹیج پر کھڑا ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں اپنی قوم کی بھلائی کیلئے کوشش کروں گا اور ضرور کروں گا۔ اور لوگوں کو جو وہ بکنا چاہیں بکنے دوں گا۔ کون سی بات ہے جو لوگوں نے میری نسبت نہیں کہی۔ اور میں نہایت خوش ہوں گا کہ جو کچھ ان کو کہنا باقی رہ گیا ہو وہ بھی اب کہہ لیں۔ اس موقع پر میں حافظ صاحبؒ کی ایک غزل پڑھوں گا جو میری فیلنگ کے مناسب ہے اور جس میں میں نے دو شعر اور ملا دیئے۔"
اس کے بعد حافظ شیرازی کی یہ غزل پڑھی:

ساقیا بر خیز و دردہ جام را
خاک بر سر کن غم ایام را
ساغر مے بر کفم نہ تا زبر
برکشم ایں دلق ازرق فام را

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں
ماتمی خواہیم ننگ و نام را

بادہ دردہ چند ازیں بادِ غرور
خاک بر سر نفس نافرجام را

دودِ آہِ سینۂ نالانِ من
سوخت ایں افسردگان خام را

محرمِ رازِ دلِ شیدائے خود
کس نمی بینم زخاص و عام را

با دِلآرامے مرا خاطر خوش است
کز دلم یکبارہ برد آرام را

ننگرد دیگر بسر اندر چمن
ہر کہ دید آں سرو سیم اندام را

کیست آں سرو سہی کاندر سرش
باختم دیں و دل و آرام را

قوم ما! اے قوم ما! کز بہر تو
دادہ ام برباد ننگ و نام را

صبر کن احمد بہ سختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

اس کے بعد کچھ گیت گائے، کچھ نظمیں ہوئیں، روپ بھرے گئے اور جلسہ ختم ہوا۔ ایکٹروں میں انگریز بھی تھے۔ جلسہ کا اختتام نیشنل اینتھم اور چند عربی اشعار پر ہوا۔

(حیات جاوید، صفحہ ۱۹۵)

بیٹے کی محبت سے بھی بڑھ کر

سرسیّد نے ۱۸۸۹ء میں اپنے چھوٹے بیٹے سیّد محمود کو جو اس وقت ہائی کورٹ میں جج تھے اور اپنی خداداد صلاحیت، تعلیمی قابلیت اور سرسیّد کے مشن سے لگن کی وجہ سے ان کی نیابت کے ہر طرح مستحق تھے، اپنا جانشین تسلیم کروالیا تھا۔ مگر ۱۸۹۳ء میں ججی سے مستعفی ہونے کے بعد ان کی صحت کو گھن لگ گیا تھا۔ اور وہ سوءِ مزاج کا شکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۷ء کے آواخر میں جب سرسیّد کی اپنی صحت جواب دینے لگی تھی، ایک

دن انہوں نے نواب زادہ آفتاب خان کو، جو کالج کے ٹرسٹی اور سرسیّد کے معتمد خاص تھے، بلا کر کہا:

سرسیّد: تم ہز آنر پیٹرن کالج (سٹیٹ گورنر، صوبہ متحدہ) کو اس مضمون کا خط لکھ کر لاؤ، جس وقت میں نے سیّد محمود کو اپنا جانشین تجویز کیا تھا تو اس وقت میں ان کو واقعی اسی قابل سمجھتا تھا۔ لیکن ان کی حالت صحت ایسی خراب ہو گئی ہے اور اس کی بہتری کی کوئی امید ہی نہیں۔ اس لئے میں آپ کو مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب میری جانشینی کے سلسلے میں قوم کو اختیار ہے کہ جو مناسب سمجھے کارروائی کرے۔ نیز میں گورنمنٹ اور پیٹرن کالج پر کوئی ذمہ داری ڈالنا نہیں چاہتا کہ وہ سیّد محمود کی جانشینی کی نسبت میری تجویز پر عمل کرے کرائے۔

اس سلسلہ میں محمد امین زبیری ''تذکرہ سرسیّد'' میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ نواب زادہ صاحب نے یہ خط لکھ کر سیّد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ قیاس کہتا ہے کہ سرسیّد نے یہ خط ''ہز آنر'' کو بھجوا دیا تھا۔ سرسیّد کی وفات کے بعد سیّد محمود کی معزولی میں سرسیّد کی آخری خواہش اور خط نے بھی ایک کردار ادا کیا۔''

(محمد امین زبیری، تذکرہ سرسیّد، صفحہ ۸۳-۳۸۲)

پھٹی ہوئی قمیض

''تذکرہ سرسیّد'' میں مولوی محمد امین زبیری لکھتے ہیں:

''آخر زمانہ میں سرسیّد پر اخراجات کا بار بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ گھریلو اخراجات کے علاوہ متعدد وظائف جو غریب طلباء کو دیتے تھے مزید برآں کالج کے ہر چندے میں پہلے اپنا چندہ دیتے تھے۔ یہ سب کچھ چھ سو روپیہ پنشن میں ہوتا تھا۔''

اس تمہید کے بعد امین زبیری ایک ایرانی شاعر سنجر طہرانی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں۔

''ایک مرتبہ میں شام کو سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کمرہ ملاقات میں بیٹھ گیا۔ اس وقت سرسیّد کہیں ضروری کام کو جانے والے تھے اور دوسرے کمرہ میں لباس تبدیل کر رہے تھے۔ نوکر نے اطلاع بھی کر دی۔ فوراً آئے، پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھے۔ مگر قمیص کی آستین دو تین جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ پھر یہ گفتگو ہوئی:

سرسیّد: معذرت کرتا ہوں۔ مجھے ابھی ابھی بہت ضروری کام سے جانا ہے۔

سنجر طہرانی: بہتر، مگر آپ قمیص تو بدل لیجئے۔

سرسیّد: اچھا۔

سنجر طہرانی: قبلہ! یہ قمیص ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ اسے پہن کر کہیں باہر جائیں۔

سرسیّد: اچھا تو بکس سے اپنی پسند کی لاؤ۔

سنجر طہرانی کہتے ہیں:
چنانچہ میں نے کمرہ میں جا کر بکس کھولا تو چار پانچ قمیصیں اور تھیں مگر سب اس سے بدتر جو پہنے ہوئے تھے۔ میں آبدیدہ ہو گیا۔ اتنے وقفے میں سرسیّد کوٹ پہن کر روانہ ہو چکے تھے۔"
(تذکرہ سرسیّد، مولوی محمد امین زبیری، صفحہ ۳۸۳)

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

سرسیّد ایک بار سخت بیمار تھے۔

ڈاکٹر: سیّد صاحب، میں نے دوا لکھی ہے۔ بہت مؤثر ہے۔
سرسیّد: اس میں الکحل، شراب تو نہیں؟
ڈاکٹر: تھوڑی ہے تو سہی۔
سرسیّد: تو پھر میں ہرگز نہ پیوں گا۔
ڈاکٹر: کیوں، یہ تو دوا ہے۔
سرسیّد: ڈاکٹر صاحب

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

(حالات و افکار سرسیّد، مولوی عبدالحق، صفحہ ۱۴)

آخری لمحے، غروب آفتاب

سرسیّد نے ۲۷، ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء کی درمیانی شب انتقال کیا۔ ان کی عادت تھی بیماری میں حسبی اللہ و نعم الوکیل بار بار پڑھا کرتے تھے۔ لبِ دم آخر یہ آیات زبان پر تھیں:

"حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر ○ ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین آمنو صلوا علیہ و سلموا تسلیما"

سرسیّد کا صندوقچہ دیکھا گیا تو اس میں پانچ روپے تھے۔ اس کی خبر سرسیّد کے وفادار قدیم خادم الٰہی بخش (عرب الٰہیا) نے نواب محسن الملک کو کی۔ نواب صاحب نے الٰہی بخش کو روپیہ دیا تو کفن آیا۔
(تذکرہ سرسیّد، مولوی محمد امین زبیری، صفحہ ۳۸۶)

ڈوبتے سورج کا منظر

۲۷، ۲۸ مارچ کی درمیانی شب سرسیّد کی عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ گیا۔ آخری لمحات کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

''ان کی عادت تھی کہ ہمیشہ بیماری کی شدت میں ''حسبی اللہ و نعم الوکیل'' بار بار پڑھا کرتے تھے۔ اس دفعہ بھی حالت نزع جاری ہونے سے پہلے قرآن کی دو آیتیں برابر ان کی زبان پر جاری رہیں:

۱۔ حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر O

۲۔ ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یاایھا الذین آمنو صلوا علیہ و سلموا تسلیما O

سر سیّد نے ویسٹ منسٹر لندن میں مشہور ماہر تعمیرات سر کرسٹوفر رین کی قبر پر لکھے اس کتبے کا ذکر کیا تھا۔ ''اگر تم اس کی یادگار تلاش کرنا چاہتے ہو تو اپنے چاروں طرف دیکھو، یہی بات آج ان کی وفات پر کہی جا سکتی ہے۔''

باب پنجم

افکار و تاثرات

(با اصول اور بامروت انسان)

بااصول اور بامروت انسان

سرسیّد کی اپنی تربیت احترام انسانیت کے سائے میں ہوئی۔ ان کا رویہ ملازموں اور خدمت گزاروں سے حد درجہ مروت کا تھا۔ چنانچہ جب کالج کے ایک بورڈر نے کسی بات پر برافروختہ ہو کر ایک خدمت گزار کو مارا تو سرسیّد بہت ناراض ہوئے۔ اور انہوں نے حکم دیا کہ اسے کالج سے خارج کر دیا جائے۔ اس پر طالب علموں نے بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اور خاصی تعداد میں طالب علم احتجاجاً کالج چھوڑ کر شہر چلے گئے۔ شہر کے رؤسا کا ایک وفد صلح صفائی کیلئے سرسیّد کے پاس آیا۔

وفد: سیّد صاحب! چھوڑیئے، بچہ ہے غلطی ہو گئی۔

سرسیّد: میں بھی لڑکوں کا دشمن نہیں ہوں۔ جب تک یہ طالب علم ملازم سے معافی نہ مانگے گا، وہ خوش دلی سے معاف نہ کرے گا، اسے کالج میں داخل نہ کیا جائے گا۔

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۷۹)

خودداری کی تعلیم

۱۸۹۲ء کا واقعہ ہے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں تھا۔ اجلاس ختم ہو گیا تھا، سب چلے گئے تھے اور حال خالی تھا۔ صرف سیّد صاحب اکیلے کھڑے اپنے کاغذ سمیٹ رہے تھے۔ اس اثناء میں طالب علم چپکے چپکے آئے اور کرسیوں پر بیٹھتے گئے۔ سیّد صاحب کی نظر پڑی۔

سرسیّد: کیا ہے؟ کیوں جمع ہو رہے ہو؟

ایک طالبعلم: کانفرنس میں بمبئی کے ایک سیٹھ صاحب آئے ہیں۔ وہ طالب علموں میں مٹھائی تقسیم کریں گے۔

سرسیّد: (برستے ہوئے) تم بڑے بے غیرت ہو، مٹھائی کے لالچ میں یہاں بھکاریوں کی طرح آ بیٹھے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آئی؟ کیا کالج سے تم نے یہی بے غیرتی سیکھی ہے۔

اس ضمن میں بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"ان کی بڑی تمنا تھی کہ مدرسۃ العلوم کے طلبہ ہمت، جرأت اور شریفانہ اخلاق سے متصف ہوں۔ اور جب کبھی کسی طالب علم سے اخلاقی جرأت یا خودداری کا فعل صادر ہوتا تو بہت خوش ہوتے۔"

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۸۰)

فاتح ہونے کا غرور

سرسیّد کے بڑے بیٹے سیّد محمود بھی بڑے عالی دماغ تھے۔ غضب کا حافظہ پایا تھا۔ مثنوی روم زبانی یاد تھی۔ قانون دانی میں ان کا بڑا مقام تھا۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس کی حیثیت سے بڑا نام پایا، ان کا چیف جسٹس سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہوگیا تھا۔ چیف جسٹس نے ان کی شکایت گورنمنٹ کو لکھ بھیجی۔ سیّد محمود نے پہلے تو اس کا مبسوط جواب لکھا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ججی سے استعفیٰ دے دیا۔ سرسیّد اس معاملے کے متعلق کچھ لکھنا یا کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کے شدید اصرار پر انہوں نے اس مسئلہ پر علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون لکھا۔

مولوی عبدالحق: قبلہ آپ نے گزٹ میں انگریز کو بہت آڑے ہاتھوں لیا ہے۔

سرسیّد: انگریز کے دماغ میں اب تک فاتح ہونے کا غرور سمایا ہوا ہے۔ اسے کسی طرح گوارا نہیں کہ گورا اور کالا ایک بینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھیں۔

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۳۱)

سیّد محمود کا ججی سے استعفیٰ

سرسیّد کے چھوٹے بیٹے سیّد محمود کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے اختلاف ہوئے تو انہوں نے ججی سے استعفیٰ دے دیا۔ کانگریس نے ایک سیاسی رخ دے کر اس واقعہ کو خوب اچھالا۔ اور اسے سرسیّد کے انگریزوں سے بدظنی اور خلاف ہونے سے تعبیر کیا۔ اخبارات میں اس پر بحث چل پڑی۔ سرسیّد نے اخبارات میں ایک وضاحتی بیان جاری کیا جس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے، بجائے نوکری کرنے یا کوئی اور غیر قومی پیشہ اختیار کرکے عام معنوں میں ترقی کرنے کے، ان کے قومی مشن کو آگے بڑھائے۔ اس پس منظر میں وہ لکھتے ہیں:

”جب کہ سیّد محمود ۱۸۲۹ میں واسطے تعلیم کے انگلستان گئے تو میری خواہش صرف یہ تھی کہ کیمبرج یونیورسٹی میں علوم انگریزی کی علی الخصوص لٹریچر کی کامل طور پر تحصیل کریں کیونکہ جو کوئی اس انگریزی لٹریچر سے واقف ہے جو انگریزوں نے نسبت اسلام اور بانی اسلام اور نسبت مسلمانوں اور ان کی حکومت اور ان کی سلطنت اور معاشرت کے لکھی ہیں وہ ضرور اس بات کی خواہش کرے گا کہ کوئی ایسا مسلمان موجود ہونا چاہیے جس کا دماغ قدرتی طور پر اس قابل ہو کہ ان غلطیوں کی جو انگریزی مصنفوں نے دانستہ یا نادانستہ نسبت اسلام یا بانی اسلام اور مسلمانوں کی حکومت اور سوشل حالت پر کی ہیں، گرفت کر سکے، اور جس کا انگریزی لٹریچر اگر انگریزوں کے نزدیک قابل پسند نہ ہو تو پڑھنے کے تو لائق ہو۔ ایسے شخص کا اس تعلیم سے مقصد یہ نہ ہو کہ روٹی کے پیچھے دوڑے۔ ہاں، بلاشبہ، روٹی کی ضرورت سب کو ہے مگر اس کا

اصلی مقصد اپنی تصنیفات سے دنیا کو ان غلطیوں کا دکھانا ہو، جو انگریزی مصنفوں نے ہمارے اسلام اور ہمارے مذہب کی نسبت کی ہیں۔ اور ہمارے نوجوان بچے جو علوم انگریزی کو بذریعہ گورنمنٹ کالجوں یا مشنری کالجوں کے تحصیل کرتے ہیں، اس سے واقف ہی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ غلط خیالات ان کتابوں کے ذریعہ سے ان کے دل میں ایسے جم جاتے ہیں جو خود اپنی تعلیم سے اسلاف کو جو فخر انسان تھے، ایک حقیر اور ان سویلائزڈ سمجھنے لگتے ہیں بلکہ اسلام کو بھی انگلش سویلائزیشن کے مقابل کرنے سے شرماتے ہیں۔

میرے تمام دوستوں کی جو ہندوستان، نیز انگلستان کی گورنمنٹ میں بہت اعلیٰ درجہ رکھتے تھے، یہ خواہش تھی کہ سیّد محمود سول سروس کے امتحان میں داخل کئے جائیں۔ اور ان کو سیّد محمود کی کامیابی کا کامل یقین تھا۔ مگر میں نے ہرگز اس کو پسند نہیں کیا۔ بیرسٹری میں بھی داخل ہونے کی میری چنداں خواہش نہ تھی کیونکہ میں ان کو ایسا شخص بنانا چاہتا تھا جو قومی ضرورت کو انجام دے۔ اور اس کا کام نہ صرف اس نسل کیلئے مفید ہو بلکہ آئندہ نسلوں کیلئے زیادہ تر مفید اور زیادہ تر کارآمد ہو۔ مگر چونکہ بیرسٹری کی تعلیم میں داخل ہونا میرے مقصد میں حارج نہ تھا، میں نے گوارا کیا تھا۔

جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو انہوں نے بیرسٹری شروع کی۔ میں یہ سمجھا تھا کہ وہ چند روزہ ہے اور بہت جلد وہ اس کام پر متوجہ ہوں گے جو میرا مقصد ان کی تعلیم سے ہے۔ مگر میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ زمانہ بیرسٹری میں بھی انہوں نے چند مفید آرٹیکل پائینئر اخبار میں لکھے۔ علی الخصوص وہ آرٹیکل جو سر ولیم میور صاحب کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' پر تھے۔

۱۸۷۸ء میں بعض امور ان کی طبع پر ناگوار ہوئے۔ اور وہ ہائی کورٹ کی بیرسٹری ترک کرنے کے ارادہ سے علی گڑھ چلے آئے۔ اس وقت مجھ کو نہایت خوشی ہوئی اور یقین ہوا کہ اب میرے مقاصد پورے ہوں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ہز ایکسی لینسی لارڈ لٹن کی جو دلی عنایت میرے حال پر اور سیّد محمود کے حال پر تھی اس نے مجبور کیا اور مجھ کو اس بات پر راضی ہونا پڑا کہ سیّد محمود اودھ میں ڈسٹرکٹ جج ہونا منظور کریں۔ اس کے بعد وہ ہائی کورٹ الٰہ آباد کے جج مقرر ہوئے۔ مگر یہ کہ وہ کیوں ہوئے اور کیوں کر ہوئے، اس کا بیان کچھ ضروری نہیں ہے۔ مگر میں نے ان کا جج ہونا پسند کیا اور نہ کچھ مجھ کو خوشی ہوئی۔

میری رائے میں ابھی وہ زمانہ نہیں ہے اور شاید نہ آئے کہ ہمارے یورپین دوست جو اس ملک کے فاتح ہیں اور جو نیچرل تفوق ان کو فتح مندی کا ہے اور ہندوستانی جو مفتوح ہیں اور

مفتوح ہونے کی نیچرل حقارت ان کو ہے وہ دونوں ایک بینچ پر بیٹھ کر مساوی اعزاز و افتخار کے ساتھ جو اس عہدہ کے شایان شان ہے، کام کر سکیں۔ اگر ہندوستانی اپنے سیلف رسپکٹ کو جو مقتضائے شرافت اور ایمانداری ہے، قائم رکھے تو دونوں کی زندگی قائم رہتی ہے۔ ہاں اگر وہ اپنے آپ کو اپنے ہمسر کی منشی کا، جس کے دل میں بہ سبب فاتح قوم کے ایک فرد ہونے کا ایک نیچرل تفوق سمایا ہوا ہے، تابع رکھے اور اس بے حمیت مسئلہ پر کہ "دارهم ما کنت فی دارهم و ارضهم ما کنت فی ارضهم" پر عمل کرے تو خوش رہتا ہے۔ مگر جو شخص اپنے کانشنس کے تابع رہنا چاہے اور اس کے خون میں بھی اپنے اسلاف کا کچھ اثر ہو تو اس سے تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔

یہ بات پوشیدہ نہیں کہ انگریزوں کا برتاؤ جو اپنی قوم کے ساتھ ہے اور جو دوسری قوم کے ساتھ ہے، اس میں وہی نسبت ہے جو سیاہ و سفید میں ہے۔ گو کوئی کچھ ہی شیخی کیا کرے مگر
ع عاقلاں خوب می دانند!

میں خوش ہوں کہ سیّد محمود کا مزاج اس قسم کا نہیں ہے۔ اور اپنے اسلاف کے خون کا ان میں اثر موجود ہے وہ ہائی کورٹ کی ججی کی کچھ بھی پروا نہیں کرتے۔ اگر ہمارے دوستوں کو اصل حالات معلوم ہوں کہ اول تقرر کے وقت کیا پیش آیا اور زمانہ قائم مقامی میں انہوں نے کیوں یادداشت تحریر کی کہ وہ مستقل نہ کئے جائیں تو ان کے استعفیٰ دینے پر ہمارے دوستوں کو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ روپے کی ان کو کچھ پروا نہیں ہے۔ نہ اس سبب سے کہ وہ دولت مند ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے دل میں استغنیٰ ہے۔ جس شخص کا مزاج ایسا ہو کہ اگر ہزاروں روپیہ ماہوار آمدنی ہو تو بھی ایک پیسہ نہ بچائے اور اگر تھوڑی آمدنی ہو تو بھی اس میں خوش رہے تو وہ روپیہ کی کیا پروا کر سکتا ہے۔ حکومت کا ان کو کچھ مزہ نہیں بلکہ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کسی عہدہ کے سبب افتخار کرنا پاجی پن جانتے ہیں۔ پھر ہائی کورٹ کی ججی کی کیا پروا کر سکتے تھے۔

وہ اکثر رباعیوں کو میرے سامنے پڑھا کرتے ہیں۔ اور یہی ان کا خیال ہے جس سے میں بھی خوش ہوں اور پسند کرتا ہوں۔ وہ رباعیاں یہ ہیں:

قطعہ ابن یمین

دوتائے نان اگر از گندم است یا از جو
دوتائے جامہ اگر کہنہ است یا خود نو

بچار گوشہ دیوار خود بہ خاطر جمع
کہ کس نگوید ازیں جا بخیر آنجا رو
ہزار بار فزوں تر برو بہ ابن یمیں
رمز مملکت کیقباد و کے خسرو

رباعی عمر خیام

درد ہر آنکہ نیم نانے دارد
از بہر نشست آشیانے دارد
نے خادم کس بود نہ مخدوم کسے
گو شاد بزی کہ خوش جہانے دارد

اگر سیّد محمود جس طرح ہوسکتا طوعاً کرہاً اور اپنے کانشنس کی اور سیلف رسپیکٹ کی پروا نہ کر کے چیف صاحب کی بھی اطاعت اور اتفاق رائے پوری پنشن کی توقع میں ہائیکورٹ کی ججی کا کام کئے جاتے تو موافق حال کے قواعد کے ان کو سات برس اور کام کرنا ضرور تھا۔ اور یہ مدت اس قدر دراز تھی کہ گوارا نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے خوب کیا جو استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ اپنے وقت کے خود بادشاہ ہو گئے۔ جو چاہیں سو کریں۔

اخبار دار السلطنت کلکتہ نے جو ان کو دوبارہ پبلک لائف میں آنے کی رغبت دلائی ہے اور اس کی متعدد صورتیں بتائی ہیں یہ ان کی عنایت و قومی ہمدردی کا مقتضیٰ ہے۔ جس کیلئے ہم شکر گزار ہیں۔ اور مقتضائے عقلمندی بھی یہی ہے۔ مگر ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں پھنسنا بھی مقتضائے دانشمندی نہیں ہے۔ آئندہ ان کو اختیار ہے جو چاہیں سو کریں۔

خدا نے ان کی طبیعت انگریزی لٹریچر کے مناسب پیدا کی ہے۔ ایک نہایت معقول اور عمدہ ذخیرہ ہر قسم کی انگریزی و عربی کتابوں کا ان کے پاس موجود ہے۔ کتب بینی کا ان کو شوق ہے۔ بس اپنی اس قابلیت کو بیرسٹری یا ججی میں صرف کرنا بہتر ہے جس میں ذاتی فائدہ ہے یا خاص خاص اشخاص کا جن کو ان کے سبب انصاف ملے یا عام مسلمانوں کے اور قوم کے اور اسلام کے فائدہ میں صرف کرنا بہتر ہے جس کی قوم اور اسلام کو شدید ضرورت ہے۔ اور جس کا فائدہ نہ موجودہ نسل کیلئے محدود ہے بلکہ آئندہ نسلوں کیلئے، موجودہ نسلوں سے بہت زیادہ مفید ہے۔ اور جس قدر اس کی ضرورت اب ہے آئندہ زمانہ میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔

"وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم"

قومی لباس

سرسیّد نے قومیت کا شعور اجاگر اور مستحکم کرنے کیلئے جہاں اور بہت سے ذرائع اختیار کئے ان میں ایک اقدام ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ کالج میں طلباء کیلئے ایک قومی لباس (یونیفارم) کا انتخاب تھا۔

حالی: قبلہ! آپ کو طلباء کیلئے یہ یونیفارم جاری کرنے کا خیال کیسے آیا؟

سرسیّد: مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا کرنے کیلئے ایک اور چیز کی ضرورت ہے۔ جس کو آج تک ہندوستان کے عام مسلمانوں نے قابل التفات نہیں سمجھا۔ حالانکہ وہ ایک نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ لباس جس کی نسبت ہمارے بزرگوں کا یہ قول تھا کہ "الناس باللباس" اور جس سے ایک قوم کی دوسری قوم سے تمیز کی جاتی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ انگرکھا، پاجامہ، ٹوپی، عمامہ، پگڑی یا جوتا، غرض کہ کوئی چیز مسلمانوں کے لباس میں ایسی نہیں ہے جس پر قومی خصوصیت کا اطلاق ہو سکے۔ ہندو، مسلمانوں میں پہلے صرف الٹے اور سیدھے پردہ کی تمیز تھی مگر جب سے اچکن کا رواج ہوا ہے یہ تمیز بھی باقی نہیں رہی۔ قطع نظر اور ملکوں کے، جہاں ہر قوم ایک خاص لباس رکھتی ہے، خود ہندوستان میں اکثر معزز قومیں ہیں جو صرف اپنے قومی لباس سے پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے پارسی، مرہٹے، بنگالی اور راجپوت وغیرہ۔ مگر مسلمانوں کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ لباس کا متحد ہونا قومی یگانگت کے بڑھانے اور مغائرت کے دور کرنے میں ویسا ہی دخل رکھتا ہے جیسا زبان، نسل و مذہب کا متحد ہونا۔ اس کے سوا جس قوم کے لباس میں کوئی قومی خصوصیت نہیں ہوتی ان کی مجلسیں، ان کے میلے اور ان کی جماعتیں دوسری قوموں کی نظر میں ایک گوہار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

اسی سبب سے مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی اور قوموں کی طرح اپنے لباس میں کوئی خصوصیت اور مابہ الامتیاز پیدا کریں۔ اور چونکہ آج ہندوستان میں کوئی مسلمان اتھارٹی ایسی موجود نہیں ہے جو ایک نیشنل لباس اختراع کرے اور اس کے رواج دینے پر زور دے اس لئے میں نے مسلمانوں کی ایک معزز ترین قوم یعنی ترکوں کا لباس اول خود اختیار کر کے قوم میں ایک مثال قائم کی اور پھر محمدن کالج کے بورڈوں کے لئے اس قاعدہ کے موافق جس پر قسطنطنیہ کی درسگاہوں میں عمل درآمد ہے یونی فارم کا قاعدہ جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر بعض موانع کے سبب وہ قاعدہ جاری نہیں ہو سکا۔ لیکن محمدن کالج کے طالب علم جو بورڈنگ ہاؤس میں آ کر رہتے ہیں، بغیر کسی جبر کے اپنے ہم چشموں کو دیکھ کر خود بخود ترکش لباس اختیار کر لیتے ہیں جو علاوہ خوش قطع اور خوش نما ہونے کے ہر موسم اور ہر

حالت کے مناسب اور قواعد حفظ صحت کے بھی موافق ہے۔ اور جب کالج چھوڑ کر وہی لباس اپنے وطن میں جا کر پہنتے ہیں تو اکثر قوم کے نوجوان ان کی دیکھا دیکھی وہی لباس اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح محمڈن کالج ہندوستان کے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ ایک قومی لباس کو رواج دے رہا ہے۔

اگر بعض تنگدل انگریز جو ہندوستانیوں کو ہمیشہ پست اور ذلیل حالت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اور وہ اس لباس سے ناراض ہوتے ہیں لیکن چونکہ گورنمنٹ نے ہم کو ہر قسم کا لباس پہننے کی آزادی دی ہے۔ اور انگریزوں میں بھی زیادہ تر وہی فیاض اور آزاد طبع ہیں جن کے ایسے متعصبانہ خیالات نہیں ہیں۔ اس لئے محمڈن کالج کے طالب علم نہایت آزادی سے ٹرکش لباس پہنتے ہیں اور کسی کی بیجا ناخوشی یا ناگواری کا خیال نہیں کرتے۔

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۷۶-۳۷۵)

قومی لباس کے بارے میں بھی سرسیّد کی عصبیت کم نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ قومی لباس کا ایک ہونا قومی یگانگت اور اتحاد کیلئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے زبان اور مذہب کا ایک ہونا۔

اس وقت ہندوستان میں مختلف مقامات پر مختلف لباس تھے۔ ان میں سے کسی میں کوئی قومی خصوصیت نہیں پائی جاتی تھی۔ سرسیّد نے قومی لباس کے طور پر اس زمانہ میں ملت اسلامیہ کی معزز ترین قوم ترکی کا لباس، بند گلے کا ٹرکش کوٹ اختیار کیا۔ اور بڑی شدومد سے کالج میں رائج کیا۔

اس ضمن میں مولوی عبدالحق جو ان دنوں ۱۸۹۴ء میں علی گڑھ کالج (مدرسۃ العلوم) میں طالبعلم تھے، لکھتے ہیں:

''سیّد صاحب کو بہت دنوں سے یہ دھن تھی کہ کالج میں قومی لباس ٹرکش کوٹ جو انہوں نے اپنے لئے بھی تجویز کیا تھا، رائج کیا جائے۔ چنانچہ اس خیال سے فرمائش کر کے کانپور کے کسی کارخانے سے نیل گوں (بلیو بلیک) سرج کا ایک تھان منگوایا۔ جب یہ کپڑا آیا تو اس میں سے ایک ترکی کوٹ اپنے لئے، ایک میرے لئے اور ایک سیّد راس مسعود کیلئے جو اس وقت کم سن تھے، سلوایا۔ سیّد محمود نے شکایت کی کہ ہمارے لئے نہیں؟ کہا، اس تھان میں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ اس سے پہلے وہ دلی سے سیاہ رنگ کے کپڑوں پر کالا بتون سے ''مدرسۃ العلوم'' کڑھوا کر لائے تھے۔ کالر پر ''مدرسہ'' دوسری طرف کڑھا ہوا تھا۔ جب کالر کا ہک لگاتے تو سامنے پورا ''دارالعلوم'' آ جاتا۔ جس وقت درزی میرا کوٹ سی کر لایا تو میں اس وقت سیّد محمود کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ مجھے بلایا، درزی نے مجھے کوٹ پہنایا اور پہنا ہی چکا تھا کہ جھٹ سیّد صاحب کرسی سے اٹھے اور مجھے سلام کیا اور کہا، ''تم میرے

ہو۔'' بجائے اس کے کہ میں سلام کرتا، انہوں نے مجھے سلام کرنے میں تقدیم کی۔ اس سے مجھ پر اس قدر شرم غالب ہوئی کہ ایک لفظ نہ کہہ سکا۔ چند روز کے بعد فرمایا کہ '' طالب علموں نام بنام دریافت کرو کہ اس لباس کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔'' میں نے ایک ایک سے پوچھا اور پوری فہرست بنا ڈالی۔''

چند روز بعد مولوی عبدالحق اور سرسیّد میں یہ گفتگو ہوئی۔

سرسیّد: کوٹ کا کیا ہوا؟

مولوی عبدالحق: سب ہی طالب علم اس لباس کو پسند کرتے ہیں، صرف دو چار......

سرسیّد: دو چار کیا؟

مولوی عبدالحق: صرف دو چار ایسے ہیں جنہیں اختلاف تو نہیں لیکن یہ کہتے ہیں اگر کوٹ کی جگہ شیروانی ہوتی تو اچھا ہوتا۔

سرسیّد: اچھا! ان کی یہ مجال؟ ان کو نکال دو۔

یہ گفتگو نقل کرنے کے بعد مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

'' سرسیّد کی خفگی چند لمحے رہی۔ پھر خاموش ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد لیفٹننٹ گورنر کالج میں تشریف لائے۔ سٹریچی ہال میں بڑا جلسہ ہوا۔ لیفٹننٹ گورنر کے ہاتھ سے انعامات تقسیم کروائے گئے۔ جو لڑکے یہ لباس پہنے ہوتے تھے انہیں سرسیّد نے اگلی صف میں خاص جگہ بٹھایا۔ جب انعام وغیرہ تقسیم ہو چکے۔ اور گورنر رخصت ہونے لگے تو وہ ان کو ہمارے پاس لائے اور خوشی خوشی لباس دکھایا۔ گورنر نے بظاہر خوشنودی کا اظہار کیا۔ وہ جب کسی طالب علم کو اس لباس میں دیکھتے تو باغ باغ ہو جاتے۔''

اس سلسلہ میں مولوی عبدالحق مزید لکھتے ہیں۔

'' جب کوئی ہندوستانی، انگریزی لباس میں ہوتا تو ناراضگی کا اظہار کرتے۔''

سرسیّد لباس کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ چنانچہ جب وائسرائے لارڈ ڈفرن نے ایک موقع پر اپنی تقریر میں اس قسم کی تبدیلی لباس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو سرسیّد نے اس کے جواب میں نہایت سخت آرٹیکل لکھا۔''

(مولوی عبدالحق، سرسید احمد خان (حالات و افکار)، صفحہ ۲۴)

رنگین شیروانی اور پگڑی میں ڈرل

سرسیّد نے ۱۸۹۴ء کے اوائل میں مدرسۃ العلوم (علی گڑھ کالج) میں قومی تشخص کو ابھارنے کیلئے طلباء کے لئے ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ اور بوٹ پر مشتمل قومی لباس تجویز اور رائج کیا تھا۔ اس زمانہ میں کالج کے معروف اور بڑے مؤثر اور صاحب اختیار انگریز پرنسپل مسٹر بیک رخصت پر انگلستان گئے ہوئے تھے۔ بقول عبدالحق، جب واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو زبان سے تو کچھ نہ کہا اور کہتے کیا، لیکن قرائن سے معلوم ہوا کہ دل ہی دل میں بہت گھٹے۔ آدمی ہوشیار تھے، خاموش رہے۔''

اسی سال پرنسپل مسٹر بیک نے سرسیّد کے مشورہ سے کالج میں فوجی ڈرل شروع کروائی۔ اس سے صرف بی اے فائنل کی کلاس مستثنٰی تھی۔ لیکن اپنی صوابدید سے اور کسی خاص مصلحت سے ہر کلاس کیلئے علیحدہ رنگ کی ریشمی شیروانی اور اسی رنگ کی مخمل کی پگڑی ڈرل یونیفارم مقرر کی۔ چنانچہ کالج کے لڑکے رنگا رنگ کے ریشمی لباس میں ڈرل پریڈ کرنے لگے۔ عجب مضحکہ خیز صورتحال تھی۔ ڈرل پریڈ جیسی چیز ریشمی کپڑوں میں کی جارہی تھی۔

پرنسپل مسٹر بیک بڑے جابر اور خود رائے تھے۔ ان دنوں ان کا اثر اور اقتدار اتنا تھا کہ طالب علم تو طالب علم، محسن الملک سمیت کالج کے ٹرسٹیوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کے خلاف سرسیّد کے سامنے زبان کھول سکیں۔

بہرحال جی کڑا کر کے (مولوی) عبدالحق اور (مولوی) حمیدالدین، سرسیّد کی کوٹھی پر پہنچے۔ جمعہ کا دن تھا، کھانے پر گفتگو شروع ہوئی۔ سرسیّد کے بیٹے جسٹس سیّد محمود کھانے کی میز پر (مولوی) عبدالحق کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سرسیّد کو ان دنوں قومی لباس کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ انہی نے ذکر چھیڑا۔

سرسیّد: میاں عبدالحق! ترکی ٹوپی، ترکی کوٹ کے بارے میں اب لڑکے کیا کہتے ہیں؟

عبدالحق: قبلہ! اب تو دوسرا ہی لباس شروع ہوگیا ہے۔

سرسیّد: وہ کیا؟

عبدالحق: جب سے ڈرل شروع ہوئی ہے تو اس کے لئے نیا لباس تجویز کیا گیا ہے۔

سرسیّد: وہ تو صرف ڈرل کیلئے ہے۔ اس سے ہمارے لباس کو کیا تعلق؟

عبدالحق: ڈرل کے لئے رنگین ریشمی شیروانیاں و ریشمی پگڑیاں تجویز کی گئی ہیں۔

سرسیّد: ہاں! میں نے بھی دیکھا زین العابدین کا بیٹا گہری سبز اچکن میں برساتی ٹڈا بنا پھرتا ہے۔

سیّدمحمود: ڈرل پریڈ انگریزوں کی چیز ہے اس لئے ہم نے یہ کام انگریز پروفیسروں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرض کرو میں ایک کلب بناتا ہوں اور اس کی ممبری کیلئے یہ شرط لگاتا ہوں کہ ہر ممبر دم لگا کر آئے، ہر ممبر کو اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ جسے یہ شرط پسند نہ ہو وہ ممبر نہ بنے۔

عبدالحق: اگر سب کیلئے یہ شرط لازم کر دیں تو پھر؟

سیّدمحمود: سوا تعلیم کے، دوسری چیز لازم نہیں ہوسکتی۔ اور کسی کو جبر کرنے کا حق نہیں۔

سرسیّد: محض اس وجہ سے ورزش یا کسی اور تحریک سے محروم کر دیا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔

عبدالحق: بات یہیں تک رہتی تو مضائقہ نہ تھا۔ لیکن بات بہت آگے بڑھ گئی ہے۔

سرسیّد: وہ کیسے؟

عبدالحق: ڈرل تعلیم کے درمیانی وقفوں میں ہوتی ہے۔ کسی جماعت کی دوسرے گھنٹے کے بعد، کسی کی تیسرے گھنٹے کے بعد۔ تو اب لڑکے ڈرل کے لباس میں الگ پوٹلیاں باندھ کے لانے سے تو رہے کہ تعلیم کا گھنٹہ ختم ہونے پر تعلیمی یونیفارم اتار کر ڈرل کی یونیفارم پہنیں۔ اس کیلئے نہ اتنی مہلت اور نہ اس کا موقع۔ لامحالہ ڈرل ہی کا نفیس رنگین لباس پہن کر کالج کی جماعتوں میں آتے ہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی ڈرل میں جا کر شریک ہوتے ہیں۔

سرسیّد: (چھری کانٹا پٹک کر جلال میں آتے ہوئے) اس میں ایک پیچ ہے۔ وہ میری عمر بھر کی محنت خاک میں ملانا چاہتا ہے۔ میں ملکہ معظمہ کی لیوی میں بھی اسی لباس میں گیا اور کوئی تبدیلی منظور نہ کی۔

سیّدمحمود: ہر شخص تو آپ سا نہیں ہوسکتا۔

سرسیّد: (سیّدمحمود سے مخاطب ہو کر) آج کالج میں میرا لیکچر ہے، تم بھی آنا۔ (مولوی عبدالحق کی طرف رخ کر کے) اب تم جاؤ۔

یہ مکالمہ نقل کرنے کے بعد مولوی عبدالحق نے اس لیکچر کی تفصیلات بھی لکھی ہیں۔ چونکہ سرسیّد کے قومی نقطہ نظر اور ان کی قومی عصبیت کو سمجھنے کیلئے اس لیکچر کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اس لئے اس قدرے طویل اقتباس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''نماز جمعہ کے بعد سیّد صاحب تشریف لائے۔ سٹریچی ہال طالب علموں سے کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے مقابل ہال کے آخر میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر ایک کرسی اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ سیّد صاحب ہال میں اس طرح داخل ہوئے جیسے کوئی جہاز آتا ہے۔ تخت پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی ور کہا کہ ایک کرسی اور

لاؤ۔ چنانچہ ایک کرسی تخت پر لا کر رکھ دی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ مسٹر بیک کہاں ہیں۔ کسی نے کہا یہ ہیں۔ وہ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سیّد صاحب نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا کہ یہاں آ کر بیٹھو۔ یہ سن کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ اور سمجھا کہ اب ضرور کوئی آفت آنے والی ہے۔ جب مسٹر بیک بیٹھ گئے تو انہوں نے اپنی تقریر یوں شروع کی۔

''عزیز طالب علمو! مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں، تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہو گی کہ تم دور دراز فاصلے اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کیلئے جمع ہو، مختلف علوم پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ منقولات، اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد...... گو وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے، جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں کی ہیں، سبق دیتے ہیں۔ مگر میں آج تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے، نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے۔ بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ جس کے حروف بہت پرکار اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے پڑھنے کیلئے، اس کو کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے کھلی رہتی ہے۔ اس کتاب کو تم کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا چاہیے کہ اس کتاب کو کیوں کر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو! اس کتاب کا نام ہے ''کالج لائف یا زندگی'' یہی اصل کتاب ہے۔ اور اس کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا اصل فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور داغ دار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ زندگی ہو گی جس کیلئے انسان کو زندہ رہنا چاہیے۔ ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں۔ بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے زندگی کے مختلف زمانوں پر تبصرہ کیا کہ بچپن میں

تمہاری کیا حالت تھی۔ اور ماؤں نے کس طرح شفقت اور محبت سے پرورش کی۔ یہ زمانہ بھی گزر گیا۔ اور دوسرا زمانہ آیا جس میں تم چلنے اور پھرنے لگے اور کھانے پینے لگے۔ یہ بھی گزر گیا۔ اور تم اب نئی زندگی میں آئے جس میں تعلیم ہوئی اور مذہبی باتیں سکھائی گئیں۔
یہ زمانہ بھی چند سال میں گزر گیا۔ اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی۔ کیونکہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمہارے پیدا ہو گئے تھے اور ہر وقت تمہاری گھات میں رہتے تھے۔ تمہارے ماں باپ نے جہاں تک ان سے ہو سکا تم کو ان دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا، کوئی کسی قدر بچا اور کسی قدر اس کے پنجے میں پھنسا رہا۔ اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ اس سے نکلنا ناممکن ہوا۔ مگر جو بچے یا کسی قدر بچے، دشمنوں نے ان کا بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ اور گھات میں لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے۔ تم انہیں دیکھتے تھے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ اور کبھی اپنی صورت اس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم ان کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالاں کہ وہ تمہارے دشمن تھے۔
یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گزر گیا۔ مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہو گئے۔ اور ان سے پناہ میں رہنے کیلئے تم نے ایک نہایت زبردست عاقل ماں تلاش کی۔ اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے۔ اور سمجھتے ہو وہ تمہاری عاقل ماں ہے کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہوئے۔ اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔
تم سمجھے کہ وہ تمہاری نئی زندگی کیا ہے؟ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گزارا تو تمہارا بیڑا پار ہے۔ ورنہ منجھدار میں ڈوبنا ہے جس کے بعد پھر ابھرنا اور تیرنا نہیں، اب تم کو اختیار ہے چاہے اپنا بیڑا پار لگاؤ، چاہو منجھدار میں ڈبوؤ۔
اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم ہندوستان کے ہوں یا پنجاب کے، پُورب کے ہوں یا پچھّم کے، اتر کے ہوں یا دکن کے، جب وہ سب تمہاری اس عاقل ماں کی

گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچّے ہو، توڑ دیا۔ اور جس طرح ایمان کیلئے کلمہ توحید پہلا رکن ایمان ہے۔ اسی طرح وحدت پہلا رکن بورڈنگ ہاؤس کی فائدہ مندی کیلئے ہے۔ جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا، تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائیوں کے آپس میں محبت اور دوستی برتو۔''

اس ضمن میں بورڈنگ ہاؤس میں ایک جگہ رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، مل کر کھیلنے، ادبی سرگرمیوں میں شریک رہنے کے اثرات کا ذکر کیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

''تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی ذہنی ہیں، ان کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس برادری اور دلی محبت اور دوستی کی جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچّے ہونے میں رکھتے ہو، ظاہری نشانی کیا ہے؟ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے، خدا کا بنایا ہوا ہے، جس کے پورا کرنے سے تم صرف دنیا ہی میں ملامت کے قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو۔ وہ نشانی کیا ہے؟ جماعت کی نماز ہے جو خدا نے جیسا کہ وہ واحد ہے، تمہاری آپس کی وحدت کیلئے مقرر کی ہے۔''

پھر نماز سے عملی طور پر یگانگت پیدا ہوتی ہے اس کی توضیح کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ:

''ایک اور چیز وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے؟ تم سب بورڈوں کا اور خصوصاً کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک لباس ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے؟ مگر یہ محض غلطی ہے۔ مذہب کی رو سے، دنیا کے برتاؤ سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں۔''

اس سلسلے میں انہوں نے مختلف جماعتوں اور فرقوں کی مثالیں دیں کہ لباس کی یکسانی سے ان میں کیسی ہمدردی اور یک جہتی اور محبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ:

''جو لباس اب تمہارا ہے یعنی ترکی ٹوپی اور کوٹ اور انگلش بوٹ، یہ نہایت عمدہ ہے۔ یہی لباس سلطان روم اور ان کے امرا اور نوکروں چاکروں کا ہے۔ اسی کو ہم نے اختیار کیا ہے۔''

اس کی تصریح کرنے کے بعد فرمایا۔

''ہندوستان میں بعض کوتاہ نظر اور کم بیں انگریز جو ہندوستانیوں کو ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ایسی ٹوپی، کوٹ اور بوٹ پہنے جانے پر اعتراض کرتے ہیں۔''

اس آخری فقرے پر اس زور سے چیئرز ہوئیں کہ سارا ہال گونج اٹھا۔ مسٹر بیک کا رنگ فق ہو گیا۔ اور منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ اس ہال میں بیسیوں کیا سینکڑوں جلسے ہوئے اور بعض بڑے اہتمام اور شان وشوکت سے ہوئے لیکن کسی جلسے میں اس جوش وخروش اور زور سے تالیاں نہیں بجائی گئیں جیسے اس موقع پر۔ اس کے بعد فرمایا کہ:

''جو انگریز ان باتوں میں تکرار کرتے ہیں میرے یقین میں وہ اس امر میں ماسٹر ہیں کہ کبھی ہندوستانیوں اور انگریزوں میں دوستی و محبت اور اخلاص کا رشتہ نہ ہو۔ باوجود ان کوششوں کے جو میں نے مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد اور دوستی پیدا کرنے کی کی ہیں، ایسے انگریز سے جو ان باتوں میں کاوش کرتا ہو، میں اس سے نہیں ملتا۔ اور دوستی کرنا نہیں چاہتا۔''

اس کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام دیر تک جاری رکھا۔ جلسہ برخاست ہونے پر طالب علم اپنے کمروں میں گئے، ریشمی ململ کی پگڑیاں نکالیں، انہیں پھاڑ پھاڑ کسی نے قیمصیں بنائیں، کسی نے کمرے کے پردے، اس طرح رنگین ریشمی کپڑوں میں ڈرل کا قصہ ختم ہوا۔''

(مولوی عبدالحق، سرسیّد احمد خان، صفحہ ۳۱)

فاؤنڈرز ڈے، یا فاؤنڈیشن ڈے

ایک مرتبہ کالج کے یورپین پروفیسروں نے کالج کا فاؤنڈرز ڈے منانے کی تجویز پیش کی۔

سرسیّد: فاؤنڈرز ڈے منانے کا مقصد کیا ہے۔

یورپین سٹاف: ولایت کے کالجوں میں فاؤنڈرز ڈے (یعنی کالج کے بانی کی سالگرہ کا دن) فاؤنڈر کو خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے بطور ایک خوشی کے دن کے منایا جاتا ہے۔ جس میں کالج کے خیر خواہ، دوست، سٹاف اور طالب علم جمع ہو کر ایک جگہ پر تکلف کھانا کھاتے ہیں۔ اور اس دن کھیل تماشے کرتے ہیں۔ یوں یہ دن کالج کی سالگرہ کا دن بن جاتا ہے۔

ہماری تجویز ہے کہ اس طرح کالج میں یہی فاؤنڈرز ڈے منایا جائے۔

سرسیّد: میں آپ لوگوں کی تجویز سے متفق نہیں ہوں۔

سٹاف: آخر کیوں؟ یہ ایک اچھی روایت ہے۔

سرسیّد: ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہاں ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپے اپنے پاس سے خرچ کر کے ایک کالج قائم کر دیتا ہے۔ ہمارے ملک کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ یہ کالج میں نے یا کسی اور ایک شخص نے کلیتًا اپنے پیسے سے یہ قائم نہیں کیا۔ یہ کالج قوم کے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے چندے سے بنا ہے۔ پوری قوم اس کی فاؤنڈر ہے۔ اس لئے کسی ایک شخص کے نام سے خواہ اس نے کیسی کاوش کی ہو، فاؤنڈرز ڈے منانا مناسب نہیں۔ البتہ فاؤنڈیشن ڈے منانے میں مضائقہ نہیں۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسہ کی ابتداء ہوئی تھی۔ یکم جنوری ۱۸۷۸ء سے کالج کلاسز شروع ہوئیں۔ آپ ان میں سے کسی دن کو 'فاؤنڈیشن ڈے' کے طور پر منایئے۔ مجھے خوشی ہو گی۔

حسِ مزاح

سرسیّد کی حسِ مزاح غیر معمولی ذہین آدمیوں کی طرح بہت تیز تھی۔ گفتگو میں، خطوں میں پُرمزاح چبھتے فقرے ان کی زبان سے نکلتے رہتے تھے۔

ایک شخص نے، جس سے سرسیّد کی کچھ پہلی وقفیت نہ تھی، اپنے متعلق کسی معاملہ میں حاکم سے سفارش کر دینے کی درخواست کی اور خط لکھا کہ:

''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کر رہے ہیں کہ ان کی تمام عمر قوم کی خیرخواہی میں گزری ہے۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھ کو یقین ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں۔ اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہو گی۔''

مندرجہ ذیل وہ خط ہے جو سرسیّد نے اس درخواست کے جواب میں ان کو بھیجا:

''جس باب میں آپ سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھ کو کچھ تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے وہ غالباً شیطان تھا۔''

(مکتوب سرسید، صفحہ ۲۹۳)

میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں ہے

ایک شخص نے سرسیّد کو اس مضمون کا خط لکھا کہ:

''میں بہت کثیر العیال ہوں۔ اور معاش کی طرف سے تنگ رہتا ہوں۔ آپ کسی ریاست میں یا سرکار انگریزی میں میری نوکری کیلئے سفارش کر دیجئے۔ میں نے انگریزی کی تعلیم تو نہیں پائی مگر عربی کی کتب درسیہ پڑھی ہیں۔ جو کام آپ میرے لائق سمجھیں اس واسطے سفارش کر دیں۔''

جواباً سرسیّد نے جو خط بھیجا وہ درج ذیل ہے۔

''میری عادت کسی کی سفارش کی نہیں۔''

(مکتوب سرسید، صفحہ ۲۶۵)

وہ بزرگ مَیں نہیں، غالباً شیطان تھا

حالی، ''حیات جاوید'' میں لکھتے ہیں۔

سر سیّد کبھی کسی اپنے پرائے کی سفارش کسی سے نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت سبب اس امر کا یہ تھا کہ وہ اپنی ملاقات، دوستی یا وجاہت سے جس قدر فائدہ پہنچا سکتے تھے، وہ مدرستہ العلوم کے سوا کسی اور کو پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دفعہ ایک ایسے شخص نے جس سے وہ قطعاً واقف نہیں تھے، ان سے رجوع کیا۔

اجنبی: میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ہیں جن کی لوگ بے انتہا تعریف کرتے ہیں کہ ان کی تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں گزری ہے جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یقین ہو گیا کہ ہوں نہ ہوں وہ بزرگ آپ ہی ہیں اور میری مشکل آپ ہی سے آسان ہو گی۔

سر سیّد: جس بات میں آپ میری سفارش چاہتے ہیں اس سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور جن بزرگ کو آپ نے خواب میں دیکھا وہ غالباً شیطان تھا۔

(صفحہ ۲۱۳)

آیاتِ قرآنی کی برکت

سر سیّد اپنے عہد کے بڑے متکلم تھے۔ یعنی انہوں نے اسلام اور قرآن حکیم کو عقلی انداز سے سمجھا۔ اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ قرآن مجید کی برکتوں کے قائل تھے۔

۱۲ اگست ۱۸۹۷ء (وفات سے ایک سال قبل) کے اک خط میں سر سیّد جالندھر کے منشی نیاز محمد خان کو لکھتے ہیں:

''آپ کی علالت طبع سے افسوس ہوا۔ مگر آپ یقین رکھیے کہ خدا تعالیٰ بہت جلد صحت کامل عطا فرمائے گا۔ میں بھی دعا کروں گا اور کرتا ہوں۔ ہمارے خالہ زاد بھائی تھے۔ ان کو نہایت درجہ کا مراق تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہائے ہائے کر کے چلایا کرتے تھے۔ ایک نہایت بزرگ نے ان سے کہا کہ میاں تم خود ہر روز سورہ یاسین پڑھ کر دَم کر لیا کرو۔ اور دل پر پھونک لیا کرو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور کامل صحت ہو گئی۔ وہ ہمیشہ وہ سورہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ پھر انکو کبھی مراق نہیں ہوا۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ خدا صحت دے گا۔ ہم اور تم دونوں قیامت کے دن انشاء اللہ تعالیٰ جناب پیغمبر خدا ﷺ کے ساتھ ہوں گے۔ مسلمان کا خاتمہ یقینی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ہوتا ہے۔ اس کے دل پر اس کا نقش ہوتا ہے۔ پس کسی مسلمان کو خاتمہ بالخیر ہونے میں شک نہیں کرنا چاہیے۔''

جاؤ، بچوں کو حساب پڑھاؤ

ڈاکٹر سر ضیاء الدین جو بعد کو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، جب ۱۸۹۵ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے ایم اے ریاضی میں تمام ہندوستان میں اول آئے تو وہاں کے گورنر نے انہیں مبارک

باد کا خط لکھا کہ میں خوش ہوں، میرے صوبے کا طالب علم ریاضی میں فرسٹ آیا۔ اور نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک معقول ملازمت کی پیشکش بھی کی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین خط لے کر خوشی خوشی سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سرسیّد اس وقت ایک تخت پر بیٹھے ہوئے کام کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا۔

سرسیّد: کیا بات ہے۔

ضیاء الدین: قبلہ، یہ خط۔

سرسیّد: (خط پڑھتے ہوئے شدید غصے سے)
جاؤ، حکومت کی نوکری کرو، کالج کو بند کر کے اس کے اوپر تالہ لگا دو۔

ضیاء الدین: (کچھ دیر حیران، پریشان کھڑے رہنے کے بعد)
حضور، میرے لئے کیا حکم ہے۔

سرسیّد: جاؤ، بچوں کو حساب پڑھاؤ۔

چنانچہ جناب سر ضیاء الدین حکم کی تعمیل میں اگلے چالیس سال وہاں حساب پڑھاتے رہے۔

تعلیم اور ایمان

سرسیّد چاہتے تھے کہ مسلمان زمانہ کے تقاضے کے مطابق انگریزی ضروری پڑھیں، جدید علوم ضرور حاصل کریں، لیکن مذہب سے برگشتہ نہ ہوں۔

حالی نے ''حیات جاوید'' میں سرسیّد کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کیا ہے۔ علی گڑھ کالج کے طلباء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

''یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم، قوم بنتی ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا۔ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی تعلیم اور اسلام) کا نمونہ ہو گے۔ اور جبھی تمہاری قوم کی عزت ہو گی۔''

(صفحہ ۲۲۵)

اسلام کی حقانیت پر وہ حق الیقین عین الیقین رکھتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے کہا:

''اگر یہ حکمت و فلسفہ جو اس زمانہ میں سچا مانا جاتا ہے، آئندہ غلط ثابت ہو جیسے کہ یونانی حکمت اب ثابت ہوتی ہے۔ اور حکمت و فلسفہ کے بالکل نئے اصول سچے ثابت ہوں تو بھی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ قرآن مجید ایسا ہی سچا ثابت ہو گا جیسا کہ اب سچا ہے۔ اور غور کرنے کے بعد ثابت ہو گا کہ جو غلطی تھی وہ ہمارے ہی علم کا فقدان تھا۔ مگر قرآن ویسا ہی سچا تھا۔''

سر سیّد اپنی کاوشوں کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے میرے دوستو! میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ میری تحقیقات ہے وہی صحیح ہے مگر جب مجھ کو بجز اس کے کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کروں، اور کچھ چارہ نہ تھا تو مجھ کو ضرور ہی کرنا تھا جو میں نے کیا یا کرتا ہوں۔ میری نیت خاص خدا کے ساتھ ہے۔ اگر میں نے برا کیا ہے وہ چاہے گا معاف کرے گا، چاہے گا نہ کرے گا۔ اگر میں نے اچھا کیا ہے تو میں اس کا صلہ کسی بندہ سے نہیں چاہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ نہ میں لوگوں کے کافر یا نیچری کہنے سے ڈرتا ہوں نہ برا مانتا ہوں۔ جو لوگ میری ان کوششوں کے سبب برا کہتے ہیں، کافر بتلاتے ہیں، میں ان سے اپنی شفاعت کا خواستگار نہیں ہوں اور نہ ہوں گا۔ جو بھلا یا برا میرا معاملہ ہے وہ خدا کے ساتھ ہے۔ اگر مجھ سے کچھ غلطی ہوئی ہے یا آئندہ ہوگی، خدا سے مجھے امید ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے گا۔''

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۲۳۰)

فنافی القوم

بابائے اردو مولوی عبدالحق ''سر سیّد احمد خان (حالات و افکار)'' میں لکھتے ہیں۔

''فرہاد کو شیریں سے اور نل کو دمن سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انہیں اپنی قوم سے تھا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، یہی ان کا درد تھا۔ وہ بلا مبالغہ فنافی القوم کے درجہ تک پہنچ گئے تھے۔ سر سیّد نے قوم کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اس سے پہلے قوم سے مراد سیّد، شیخ، مغل، پٹھان تھی۔ سر سیّد نے اسے نیشن (Nation) کا ہم معنی بنا دیا۔ اور مسلمانوں میں قومیت کا تصور پیدا کیا۔''

(صفحہ ۶۹)

تعلیم کے حوالے سے

(تعلیم و تربیت)

تعلیم

''میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے چتکبرے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے، کہ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھندلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو تراش تراش کر سڈول نہیں بناتا، اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی پر چھپے رہتے ہیں۔ اور اس کی خوش نمانسیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو، مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی شبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موتی مورت ایک پتھر کے ڈھوے میں چھپی ہوتی ہے، مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو اس میں سے گھڑ دیتا ہے۔ مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے، مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے۔ جو نسبت کہ مورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوے سے ہے، وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔

بڑے بڑے حکیم و عالم، ولی و ابدال، نیک و عقلمند، بہادر و نامور، ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں، تو ان نیکیوں سے، جو ان میں ہیں مگر ناشائستہ، اور اس دلیری اور جرأت سے، جو ان میں ہے مگر خوفناک، اور اس استقلال سے جو ان میں ہے مگر بے ڈھنگا، اور دانائی اور عقلمندی سے جو ان میں ہے مگر جانوروں کے سے مکروفریب سے ملی ہوئی، اور اس صبر و قناعت سے جو ان میں ہے اور گویا ناامیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں، نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ انسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں۔ اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت ان کو ہوتی ہے، اور جس قدر کہ عقل ان جوشوں کو درست کرتی ہے، اسی قدر مختلف طور پر ان سے کام ہوتے ہیں۔

امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر، یا ایک کام سے چھڑا کے دوسرے کام کے لگانے جانے پر، جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں، یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر بھسم ہو جاتی ہے، تو کون شخص ہے جو ان کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا، گو کہ کیسے ہی ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے؟ اس قسم کی اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں، گو وہ وحشی پنے کے حالت میں کیوں نہ ہوں، لیکن اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے، تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں۔ اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں!

مجھ کو اسی بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں، پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں، پر بے ڈھنگا، ان کو نہایت دانا اور عقلمند پاتا ہوں، پر اکثر مکروفریب اور زور سے ملے ہوئے، ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے، مگر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں، تو دین و دنیا دونوں کے لئے کیسے مفید ہوں۔

تعلیم سے ہماری مراد، موافق عرف عام کے، لکھنے، پڑھنے، سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے، خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو، یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل کندہ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو، زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے۔

ان تعلیم پانے والوں میں سے لاکھوں آدمی تو ایسے ہوتے ہیں کہ ادنیٰ درجہ تعلیم تک پہنچ کر، اور کچھ متوسط درجہ کی تعلیم تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ اور چند ایسے لوگ ہوتے ہیں، کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے بڑھتے ہیں، اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بننا چاہتا ہے، کوئی ادیب، کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے، کوئی ریاضیات میں اور کوئی دینیات میں، علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے، اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اس کو ذریعہ معاش ضرور سمجھتا ہے۔

تعلیم، بغیر اس کے کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کی جاوے، غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کی تعلیم کا عروج ہوتا ہے، وہی زبان اس کے لئے اختیار کی جاتی ہے۔ اس زمانہ تعلیم میں، جو بذریعہ انگریزی زبان کے ہوتی ہے، اور اگلے زمانہ کی تعلیم میں، جو بذریعہ عربی زبان کے ہوتی تھی، یہ فرق ہے کہ اگلے زمانہ میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا کہ ہر شخص، ہر علم کی شاخ میں، یا شاخوں میں، اس زمانہ کے موافق اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاتا اور اس فن کا ماسٹر ہونا چاہئے تو ہو سکتا تھا۔ اور سوسائٹی جو اس زمانہ میں موجود تھی، اس تعلیم کی مدد کرتی تھی۔ اور اس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اس کو سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسن معاشرت کے ایسی عمدہ تھی، کہ اس میں کوئی نقص اس زمانہ میں نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ کے اقبال کے ساتھ وہ قائم نہ رہی!

اس زمانہ کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے، اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلاشبہ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتی ہیں مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔

ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے، ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماً اور نیک خدا پرست، رحم دل، نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی، وہ مدت ہوئی کہ مردہ ہو گئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی، جو زمانہ حال کے موافق ہو، اب تک قائم نہیں ہوئی، یا مکمل نہیں ہوئی ہے۔

دماغی تعلیم جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا، کچھ شبہ نہیں کہ انسان کو انسان، اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت مدد کرتی ہے۔ مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے۔ اور اس کے لئے ان کا اس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو، جسے سائنسز اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے، زیادہ وسعت دی جاوے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اگر اس کی مراد

حرفت کی تعلیم سے ہے، جیسے لوہاری، نجاری، نوربانی وغیرہ وغیرہ تو اس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اس باب میں تفوق ہے تو وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے وہ ان ملکوں میں (مشینی) کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والے وہ لوگ نہیں ہیں جو ان میں کام کرتے ہیں، بلکہ کلوں کو قائم کرنے والی ایک جدا جماعت ہے۔
سائنس بلاشبہ نہایت عمدہ چیز ہے، اور سائنس کا جاننے والا آج کل کے زمانہ میں قریب قریب ہر حرفت پر پورا پورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اس کے پاس ہوتا ہے، جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔''
(مقالاتِ سرسید، صفحہ ۷۹)

تعلیم و تربیت

''تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ انسان میں ہے، اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے، اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا، اس کی تربیت کرنا ہے۔ مثلاً جو قوتیں خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے۔ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔

انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کو باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے، بلکہ اس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے سرجی چشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے، جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے، اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔ اور انسان کو تربیت کرنا اور اس سے کام کا لینا ہے، جیسے جہاز تیار ہونے کے بعد اس پر بوجھ لادنا، اور حوض بنانے کے بعد اس میں پانی بھرنا۔ پر تربیت پانے سے تعلیم کا پانا بھی ضرور نہیں ہے۔ تربیت چاہو جتنی کرو! اور تربیت کرتے کرتے منہ تک بھر دو! مگر اس سے دل کے سرج سوتے نہیں کھلتیں، بلکہ بند ہو جاتے ہیں۔

اندرونی قویٰ حرکت دیئے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے، مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے ممکن ہے کہ اس شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو، اور تعلیم بہت بری۔ یہی حال ٹھیک ٹھیک ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو بہت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ، مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں۔ بھاری بھرکم عمامہ و دستار، جبہ و کرتہ سے بہت کچھ، مگر دل کی اور اندرونی قویٰ کی شگفتگی دیکھو، تو کچھ بھی نہیں۔

نہایت عمدہ قول ہے کہ کتابوں کا پڑھا دینا تو تعلیم کا نہایت ادنیٰ اور سب سے زیادہ حقیر جزو ہے۔ بلکہ اس قسم کے بہت سے پڑھنے سے جس میں اندرونی قویٰ کی تحریک اور شگفتگی نہ ہو، جس قدر دل کے قویٰ کمزور اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، ایسے اور کسی چیز سے نہیں ہوتے۔

ہم اپنے ہاں کے عالموں کا حال بالکل یہی دیکھتے ہیں کہ ان کے روحانی قویٰ بالکل نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اور صرف زبانی بک بک یا تکبر و غرور، اور اپنے آپ کو بے مثل و

بے نظیر قابل ادب، سمجھنے کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا۔ زندہ ہوتے ہیں مگر دلی اا
روحانی قویٰ کی شگفتگی کے اعتبار سے بالکل مردار ہوتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں، اا
جس قدر عمدہ کتابیں افراط سے بہم پہنچیں ان کو اور زیادہ پڑھتے ہیں، اور ان سے تربیت
حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بیل کی مانند ہو جاتے ہیں جو برابر چرتا ہے، اور پھر بھی چراگاہ
ہی میں رہنے کی خواہش کرتا ہے۔ پس کتابیں پڑھ لینے سے انسانیت نہیں آجاتی، بلکہ وہ
کتابی علم خود ان پر بوجھ ہوتا ہے۔

ہمارا مطلب یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ، جو ہم پر نازل ہیں، یہی ہے کہ ہم نے اپنے دل
کو، اور اپنے اندرونی قویٰ کو بالکل خراب کر دیا ہے۔ علم جو حاصل کرتے ہیں وہ بھی بعوض
اس کے کہ روحانی قویٰ کو سرسبز و شاداب کرے، ان کو پژمردہ کر دیتا ہے، اور ہمارے قویٰ کو
جو درحقیقت سرچشمے تمام نیکیوں کے ہیں، بالکل کمزور اور ناکارہ کر دیتا ہے۔ اور ہماری
حالت تمام معاملات میں، کیا دین کے کیا دنیا کے، خراب ہوتی چلی جاتی ہے۔

پس ہم کو اپنے پر رحم کرنا چاہیے، اور ایسی تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے جو اندرونی قویٰ کو شگفتہ اور
شاداب کرے، اور دل کے سوتوں کو کھول کر سرچی چشمہ سے پانی باہر نکالے، جس سے
ہماری زندگی سرسبز و شاداب ہو۔"

تعلیم و تربیت کے اصول

حالی: قبلہ، سید صاحب! کالج کو چلتے ہوئے اب بیس برس سے اوپر ہو گئے ۔ اس کی کونسی خصوصیتیں اسے ملک کے دوسرے ایسے اداروں سے ممیز کرتی ہیں؟

سرسید: اگر تعلیمی نتائج سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو محمڈن کالج میں ضرور ایسی خصوصیتیں موجود ہیں جن کے لحاظ سے اس کو ہندوستان کے دیگر کالجوں کی نسبت زیادہ مفید کہا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک نہایت صاف اور صریح خصوصیت کالج مذکور کی یہ ہے کہ اس میں ہر سال جس قدر روپیہ سکالرشپوں میں خرچ کیا جاتا ہے ظاہراً ہندوستان کے کسی گورنمنٹ کالج یا پرائیویٹ کالج میں صرف نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ مسلمانوں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غریب طالب علموں کی مالی حالت کے لحاظ سے یہاں سب جگہ سے زیادہ اس بات میں کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے غریب طالب علموں کو جو شوقین اور ہونہار معلوم ہوتے ہیں، سکالرشپوں کے ذریعہ سے تعلیم میں مدد دی جائے۔ اور تا بمقدور، غریب اور آسودہ حال طلبہ تقریباً یکساں حالت میں طالب علمی کا زمانہ بسر کریں۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے لے کر ۱۸۹۶ء تک یعنی چھ سال میں کچھ کم ستائیس ہزار روپیہ اس کالج کے طلبہ سکالرشپوں اور وظیفوں میں دیا گیا ہے۔ اگر ذی مقدور مسلمانوں کو منتظمین کالج کی نسبت ایک سواں حصہ بھی قوم میں تعلیم پھیلانے کا خیال ہو تو مذکورہ بالا رقم سے دس حصہ زیادہ روپیہ اس مد میں صرف ہو سکتا ہے۔ لیکن بڑی خصوصیت اس کالج کی، سامان تربیت ہے جس کو ہم نے ہمیشہ تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری سمجھا ہے۔ اور جس کے بغیر فی الواقع تعلیم کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ہماری درسگاہوں میں کبھی خیال نہیں کیا گیا۔ اور اسی لئے ہم لوگ تربیت کے مفہوم سے جیسی کہ چاہیے، واقفیت نہیں رکھتے۔

حالی: آپ کی نظر میں تربیت کا پیغام اور اہمیت کیا ہے۔ اور مدرستہ العلوم میں یہ تربیت کس طرح ہو رہی ہے؟

سرسید: ہمارے ہاں تربیت اولاد کا آلہ زیادہ تر تعلیم و تلقین، نصیحت، پند، زجر و توبیخ، یا زد و کوب کو

سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ تمام وسائل جب تک کہ لڑکے ایک معتد بہ زمانہ تک عمدہ سوسائٹی میں نہ رہیں اکثر صورتوں میں محض فضول اور بیکار ثابت ہوئے ہیں۔ مذکورہ بالا وسائل سے اوّل تو اکثر صورتوں میں مضر نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی عمدہ اثر دلوں پر ہوتا بھی ہے تو وہ نقش برآب کی طرح جلد زائل ہو جاتا ہے۔ اسی سوسائٹی کے اثر سے اہل یورپ کے اخلاق اصولاً ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی سوسائٹی کے میسر نہ ہونے سے ہم لوگوں کے اخلاق و عادات میں باہم زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے لڑکے جب کسی درسگاہ میں آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ ان کو کچھ سکھایا اور یاد کرایا جائے، زیادہ تر اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے گھروں سے سیکھ کر آئے ہیں اس کو بالکل ان کے دلوں سے بھلا دیا جائے۔ قطع نظر ان عام خرابیوں کے جو ہندوستانیوں کے اخلاق اور معاشرت میں پائی جاتی ہیں، ہم خاص کر ان چند خصلتوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ منسوب کی جاتی ہیں، جیسے مذہبی، تعصبات، باہمی نزاع، رشک و حسد، غیبت، بدگمانی، کاہلی، تن آسانی، تضیع اوقات، ادائے فرائض میں سستی، غصہ، بے اعتدالی، نافرمانی وغیرہ وغیرہ۔ اور کچھ شک نہیں کہ ان میں سے اکثر خصلتیں مسلمانوں میں بہ نسبت دیگر اقوام کے زیادہ دیکھی جاتی ہیں۔ یہی باتیں جب چھوٹے، بڑوں میں دیکھتے ہیں تو ان کی طبیعتوں میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی جاتی ہیں۔ اور آخر کار ان کی طبیعت ثانی بن جاتی ہیں۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح تعلیم کے نتیجے اعداد کے ذریعے سے دکھائے جا سکتے ہیں، اس طرح تربیت کے نتائج نہیں دکھائے جا سکتے۔ نیز تعلیم کا اثر دفعتاً اور نمایاں ہوتا ہے۔ اور تربیت کا اثر نامعلوم اور بتدریج ہوتا ہے۔ جس طرح دھوپ اور ہوا اور پانی کی تاثیر سے پودے جو آہستہ آہستہ نشو و نما پاتے ہیں، ان کا نمو کرنا مالی کے سوا ہر شخص کو فوراً محسوس نہیں ہوتا، اسی طرح تربیت کے نتائج بدیہی طور پر ایک مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ کالج اور بورڈنگ ہاؤس کو قائم ہوئے کچھ بہت عرصہ نہیں گزرا اس لئے یہاں ہم کو زیادہ تر یہ دکھانا مقصود ہے کہ محمڈن کالج میں مسلمان طلبہ کی تربیت کا کیا سامان مہیا کیا گیا ہے؟ وہ کہاں تک ان کی حالت کا مناسب ہے؟ اور اس سے آئندہ کن نتائج کی توقع ہو سکتی ہے؟ نہ یہ کہ اس طرح تربیت سے اب تک کیا نتیجے مرتب ہو چکے ہیں؟

سب سے زیادہ ضرورت مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ نسلوں میں اتفاق و یکجہتی و قومی ہمدردی پیدا کرنے کی ہے، جس کے نہ ہونے سے تمام قوم روز بروز مضمحل اور تباہ و برباد ہوتی جاتی ہے۔ یہ امید رکھنی کہ وعظ و نصیحت، یا اخباروں اور رسالوں میں اتفاق کے فوائد پر

بڑے بڑے آرٹیکل لکھنے سے، یا اس مضمون پر زوردار اور موثر نظمیں شائع کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا ہو جائے گا، ایسی ہی بات ہے جیسے حُب کے عمل سے دشمنوں میں دوستی پیدا کرنی۔ ان میں اتفاق ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ان کی نسلیں اتفاق کے سایہ میں نشو ونما پائیں۔ اور ایک مدت تک ایسی سوسائٹی میں زندگی بسر کریں جہاں مختلف خاندانوں، مختلف صوبوں اور مختلف فقہوں اور مسلکوں کے لڑکے ایک ہال میں کھانا کھائیں، ایک مسجد میں نماز پڑھیں، ایک فیلڈ میں مردانہ کھیل کھیلیں، ایک میدان میں گھوڑے دوڑائیں، ایک کلب میں ڈبیٹ کریں، ایک کالج میں پڑھیں اور ایک احاطہ میں دن رات سگے بھائیوں کی طرح شیر وشکر ہو کر رہیں۔ اور اس طرح اتفاق کی حلاوت ماں کے دودھ کی طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے۔

ریاضت جسمانی، جس کا سامان محمڈن کالج میں ہندوستان کے تمام کالجوں سے زیادہ مہیا کیا گیا ہے اور جس میں یہاں کہ طالب علموں نے تمام ممالک میں بڑی شہرت حاصل کی ہے، اکثر لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے طالب علموں کی طبیعت تعلیم سے اچاٹ ہو جاتی ہے۔ اور کالج میں رہنے سے جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن صرف ان کی تنقید ہی سے ریاضت جسمانی کو محمڈن کالج میں ضروری نہیں ٹھہرایا گیا۔ بلکہ اس لئے اس کا زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں وہ قوم میں مستعدی اور جفاکشی کی مثال ہوں۔ اور سستی اور کاہلی جو مسلمانوں کی ایک قومی خصلت سمجھی جانے لگی ہے بجائے اس کے وہ ان میں چستی و چالاکی کی بنیاد ڈالیں۔ وہ برخلاف ان کتاب کے کیڑوں کے جو اپنے تمام قوائے دماغی کتاب کی نذر کر دیتے ہیں اور زندہ دلی و شگفتگی اور تمام امنگیں اور چاؤ بلکہ بعض صورتوں میں اپنی زندگی تک تعلیم پر قربان کر دیتے ہیں، جب کالج کو چھوڑ کر جائیں تو لکھنے پڑھنے کے علاوہ وہ دنیا کے تمام کاموں کے لائق ثابت ہوں۔

وہ ہندوستان کی عام حالت کے برخلاف، جہاں ایک شخص کا سپاہی اور عالم ہونا گویا اجتماع ضدین سمجھا جاتا ہے، تعلیم یافتہ بھی ہوں اور سپاہی بھی۔ وہ ان فرسودہ دماغوں کی طرح جن میں کثرت مطالعہ سے تحمل اور برداشت کی طاقت نہیں رہتی۔ چڑچڑے، نازک مزاج، اور بددماغ نہ بن جائیں۔ اگر ان کو یورپین افسروں کی ماتحتی میں رہنے کا اتفاق ہو تو محنت اور جفاکشی کے موقعوں پر ان کا ساتھ دینے سے عاجز اور ان کی نظر میں ذلیل نہ ہوں۔ وہ ملکی اور فوجی دونوں قسم کی خدمات کیلئے منتخب ہو سکیں۔ اگر ان کو نوکری میسر نہ آئے تو اپنے دست و بازو پر بھروسہ کر کے ہر کام پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکیں۔ ان میں ایسی مستعدی پیدا ہو

جائے کہ بے کاری اور آرام طلبی جو مسلمانوں کی قومی خصلت بن گئی ہے اور جس کے سبب سے عرب میں ''ہندی بطال'' (نکما، بیکار) ایک مثال ہو گئی ہے، اُن کو وبال معلوم ہونے لگے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر سے نہ ہچکچائیں۔ وہ سختیوں کے جھیلنے کے عادی ہو جائیں۔ انہی اغراض کیلئے محمڈن کالج میں ریاضت جسمانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ محض تعلیم سے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس میں دلیری اور مستعدی کا عنصر پیدا نہ ہو۔ لارڈ ڈفرن اپنے عہد حکومت میں جب محمڈن کالج کے ملاحظہ کو آئے اور ایڈریس میں کرکٹ وغیرہ کا ذکر سنا تو اس کا جواب دیتے وقت انہوں نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا کہ

''ہماری قوم نے پہلی فتح کرکٹ کے میدان میں حاصل کی تھی۔''

ایک حکیم کا قول ہے کہ ''قومی قوت صحت پر منحصر ہے۔'' اور چونکہ صحت کے بغیر ریاضت جسمانی کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے یہ کہنا چاہیے کہ قومی قوت ریاضت جسمانی پر منحصر ہے۔ خصوصاً جس قوم کو خدا نے ہم پر حکمران کیا ہے اور جن کی پسند اور انتخاب کے ساتھ ہماری تمام امیدیں وابستہ ہیں، ان کے برابر کوئی قوم روئے زمین پر ریاضت جسمانی کی فریفتہ نہیں۔ ان کو شیر خوارگی کے زمانہ سے ریاضت کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اور جب تک مرض الموت میں مبتلا نہیں ہوتے کبھی ریاضت ترک نہیں کرتے۔

علاوہ معمولی کھیلوں اور ریاضتوں کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کوس گھوڑے یا بائیسکل پر یا پیادہ پا سفر کرتے ہیں، کشتیاں کھیتے ہیں، گاڑیاں ہانکتے ہیں، برف پر دوڑتے ہیں، پہاڑوں پر چڑھتے ہیں، کانوں میں اترتے ہیں، لکڑیاں چیرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مصر کا ایک لائق مسلمان اپنے سفر نامہ یورپ میں لکھتا ہے کہ ''مخاطر و مہالک میں گھس جانا، اخیر دم تک اپنے ارادہ پر ثابت قدم رہنا اور جس قدر مشکلات پیش آئیں اسی قدر زیادہ ثبات اور استقلال سے ان کا مقابلہ کرنا، دنیا کی کسی قوم میں ایسا نہیں پایا جاتا جیسا انگریزوں کی قوم میں پایا جاتا ہے۔'' ایسی قوم کی نظر میں کیا ہمارے نوجوان، جب تک کہ انہی کے برابر بلکہ ان سے زیادہ جفاکش، محنتی، دلیر اور مستعد نہ ہوں، محض کتاب کا کیڑا بننے سے کچھ اعتبار یا وقعت حاصل کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

جو لوگ گورنمنٹ سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم کو والنٹیئر بنایا جائے اور ہم کو فوج میں معزز عہدے دیئے جائیں، جب تک کہ وہ بھی مثل انگریزوں کے اپنے تئیں ایجوکیٹڈ سپاہی نہ بنائیں، ہرگز ایسی خواہش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتے۔ اور اسی لئے محمڈن کالج کے بانیوں نے

ریاضت جسمانی کو تعلیم کا جزو غیر ینفک قرار دیا ہے۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ کرکٹ، فٹبال اور جمناسٹک وغیرہ کے شوقین تعلیم میں کوشش نہیں کرتے یا لکھنے پڑھنے سے ان کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ جس کالج ٹیم نے پچھلے دنوں بمبئی میں پارسی ٹیم اور پٹیالہ ٹیم پر دو نمایاں فتوحات حاصل کی تھیں ان میں کئی گریجویٹ تھے اور باقی جتنے کالج کلاسوں میں پڑھتے تھے وہ سب تعلیم کے لحاظ سے بھی اپنی جماعتوں میں اچھے سمجھے جاتے تھے۔

ایک اور فائدہ بورڈنگ سسٹم سے طالب علموں کیلئے یہ سمجھا گیا ہے کہ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے سے ان کو ضبط اوقات کی عادت پڑتی ہے۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کی اولاد تضیع اوقات کرنے والی مشہور ہے۔ حالانکہ جس قوم کی گورنمنٹ سے ہمارے نوجوان نوکریوں کے خواستگار ہیں اس کا ایک ایک فرد وقت کو اپنی دولت بلکہ اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے اور فی الحقیقت جو لوگ وقت کی کچھ قدر نہیں کرتے، نہ وہ دین کے فرائض ادا کر سکتے ہیں نہ دنیا کے۔

وقت کی پابندی بھی وعظ و نصیحت سے یا کتابوں میں اس کی خوبیاں پڑھنے سے یا کسی نفع کی امید یا نقصان کے خوف سے نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک مدت تک اس کی مشق کرنے سے ہوتی ہے۔ محمڈن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں جو صغیر سن لڑکے ایک الگ وارڈ میں رہتے ہیں ان کی بناء ایسی ڈالی گئی ہے جس سے امید ہوتی ہے کہ وہ کالج سے نکل کر ہمیشہ اوقات کے پابند رہیں گے۔

صبح کے پانچ بجے سے رات کے نو بجے تک وہ مختلف فرائض میں جکڑے رہتے ہیں، نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا، ہوا خوری کرنا، یا گیند بلا کھیلنا، مارننگ سکول، نائٹ سکول اور بڑے سکول میں پڑھنا، کھانا کھانا، مطالعہ کرنا اور سونا یا سو کر اٹھنا، غرض ہر ایک کام کیلئے خاص اوقات مقرر ہیں جن میں بیماری کے سوا کبھی فرق نہیں آنے پاتا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ دس برس تک جب ان کی زندگی اس پابندی اوقات کے ساتھ گزرے گی تو خدشہ نہیں کہ وہ عمر بھر اس عادت کو ترک کر سکیں۔ اگرچہ بڑی عمر کے لڑکوں کیلئے بھی فرائض اور اوقات مقرر ہیں مگر جو عادت بچپن میں ڈالی جاتی ہے وہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہے، بخلاف بڑی عمر کے لڑکوں کے کہ اول تو ان کو بچوں کے برابر کالج میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوتا، دوسرے جو عادتیں وہ باہر سے سیکھ کر آتے ہیں ان کا زائل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لئے محمڈن کالج میں بچپن سے رہنا بہ نسبت بڑی عمر کے لڑکوں کے زیادہ مفید ہے۔

شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت و فرمانبرداری جو ہر قوم کا اور خاص کر محکوم قوم کا زیور ہے اس کی عادت ڈلوانے اور مشق کرانے کے جو ذریعے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہیں، ظاہرا ہندوستان کے کسی انسٹی ٹیوٹ میں موجود نہیں ہیں۔ علاوہ کالج اور ہائی سکول اور مارننگ سکول اور نائٹ سکول کے جہاں طالب علموں کو برابر پروفیسروں اور ماسٹروں کے آرڈر میں رہنا ضروری ہے، وہ ہر وقت اپنے تئیں کسی نہ کسی ہیڈ یا افسر کے زیر حکم پاتے ہیں۔ جب تک وہ بورڈنگ ہاؤس میں ہیں، پراکٹر کے محکوم ہیں۔ جب تک ڈائننگ ہال میں رہتے ہیں ایک یورپین پروفیسر ان کا نگران رہتا ہے۔ اسی طرح فیلڈ میں پرووسٹ یا کیپٹن، یونین کلب میں پریذیڈنٹ یا اس کا قائم مقام، جمناسٹک اور قواعد کے وقت ڈرل ماسٹر، گھوڑے کی سواری کے وقت رائڈنگ ماسٹر، بیماری کی حالت میں ڈاکٹر، اور مسجد میں ایک دیندار عالم، سب ان کی روک روک کیلئے مقرر ہیں جن کا حکم ماننا ان کو ضرور ہے۔

ظاہر ہے جب برابر آٹھ سات برس طالب علموں کی زندگی ان ضوابط کے ساتھ بسر ہو گی تو کس قدر باقاعدگی اور اطاعت ان کی طبیعت میں پیدا ہو جائے گی۔ اور کس قدر وہ دنیا میں ہر جگہ ہر دلعزیز ہو کر رہنا سیکھ جائیں گے۔

ایسی اطاعت جو قواعد و اصول پر مبنی ہو اس کی عادت اولاد کو ابتدائے عمر میں ڈلوانی ایسی ہی ضروری ہے جیسے ایلل بچھڑے کو سدھا کر اور باگوں پر صاف کر کے سواری کے قابل بنانا۔ جس طرح انوکھے اور سرکش گھوڑے کا کوئی خریدار نہیں ہوتا اسی طرح نافرمان آدمی کہیں عزیز نہیں سمجھا جاتا۔ اکثر انگریز افسروں نے لوگوں سے یہ شکایت کی ہے مسلمان ایسے فرماں بردار نہیں ہوتے جیسے ہندو، اور اسی لئے یورپین افسر، ان کی نسبت ہندوؤں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع یہ شکایت صحیح ہے تو مسلمانوں کی اولاد جن کا مدار معاش اب تک صرف نوکری پر رہا ہے ان کو سب سے زیادہ اطاعت اور فرمانبرداری سکھانے کی ضرورت ہے۔ یہ سمجھنا کہ آزادی اور اطاعت میں تفاوت ہے، صحیح نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دنیا میں سب سے زیادہ آزاد خیال اور آزاد طبع سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ان سے بڑھ کر کوئی اپنے افسر کا حکم ماننے والا اور قانون پر چلنے والا اور قواعد کی پابندی کرنے والا نہیں ہوتا۔ پس محمڈن کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہنے سے مسلمانوں کی اولاد ایک ایسی خصلت سیکھتی ہے جس پر اس کی تمام آئندہ کامیابیاں منحصر ہیں۔

(حیات جاوید، حالی، صفحہ ۹۳۔۹۶)

تمت بالخیر

تصانیف و تالیفات

1- Learning to Lead
2- In Search of Maturity
3- From School to College
4- A Lasting Light House
5- In Search of Character
6- Beacon Light
7- Light a Candle
8- Character and Conduct of Quaid-e-Azam
9- Teacher Guide

10- حیاتِ قائداعظم
11- تذکرۂ اقبال
12- مکالمات اقبال
13- گفتار و کردار قائداعظم
14- کردار کی کرنیں
15- کردار ساز
16- شاد باد منزل مراد
17- پاکستانیت اور کیریکٹر بلڈنگ
18- کیریکٹر بلڈنگ اور پبلک سپیکنگ
19- تذکرہ شہداء
20- جرأتوں کے نشاں
21- میجر اکرم شہید نشان حیدر
22- کرنل حق نواز شہید ستارہ جرأت
23- شہید سیاچن
24- چراغوں کی قطار
25- داستانِ علم و عمل (جلد اول، دوم، سوم)
26- آدمی میں انسان کی تلاش
27- دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو
28- روشن راہیں
29- دانائی کی تلاش (جلد اول، دوم)
30- گفتار و کردار سرسید

اپنے حصّے کا دیا

چینی
معلم اخلاق
کنفیوشس
نے کہا
بہتر ہے
مٹی کا
ایک چھوٹا سا
دیا
جلا دینا
اندھیرے کو
مسلسل
برا کہتے رہنے سے

بہتر ہے
گھپ اندھیرے
میں
سرِ راہ
ایک چھوٹی سی
موم بتی
جلا دینا

کسی
سورج کا
انتظار
کرتے رہنے سے
کسی اجنبی
مشعل بردار
جلوس کی
راہ
تکتے رہنے سے

خود غرضیوں کی
ڈسی ہوئی
ارضِ وطن کی
ہر اندھیری راہ
ہر
تاریک گلی
اپنے سرسید
اپنے ایدھی کا
انتظار
کر رہی ہے

ارضِ پاکستان کی
ہر شب گزیدہ
بستی
سے
ایک دردناک
صدا
آ رہی ہے
میرے بیٹو!
میری بیٹیو!
کہاں ہو
کہاں ہو
دیا جلاؤ
دیا جلاؤ
اپنے حصے
کا!
اپنے حصے
کا!

پروفیسر سعید راشد